اگست ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ میثاق لاہور

زیر سرپرستی
امین احسن اصلاحی

مدیر مسؤل
اسرار احمد

جلد ۱۶ | اگست ۱۹۶۹ء | عدد ۸

تذکرہ و تبصرہ	★ مجوزہ تعلیمی پالیسی	...... ڈاکٹر محمد رفیع الدین	۱
تدبر قرآن	★ تفسیر سورۂ الانعام (۸)	مولانا امین احسن اصلاحی	۱۷
مقالات	★ اسلامی ریاست میں عقیدہ اور مذہب و مسلک کی آزادی	,, ,, ,,	۲۹
	★ ہماری موجودہ سائنس کی درسی کتابوں کے نقائص	ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے-پی ایچ ڈی-ڈی لٹ	۴۱
	★ منشور اسلام (۲)	,, ,, ,,	۴۹
	★ پیغام اقبال (۲)	......پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۵۹
	★ تعلیمات جنید رح (۲)......	,, ,, ,, ,, ,,	۶۹

یکے از مطبوعات

دارالاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

کوثر روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 (فون 69522)

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی تالیف

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

پر معاصر "یقین انٹرنیشنل" کا تبصرہ:-

" Dr. Rafi-ud-Din is already known to us, not only as Director, All-Pakistan Educational Congress, Lahore, and formerly Director, Iqbal Academy Pakistan, Karachi, but also as one of those rare Muslim Educationists who have the courage and insight to expose the fallacies of Western thinkers on Education. His 'First Principles of Education' of which an Urdu translation is also available from All Pakistan Educational Conference, Karachi, is a work of extraordinary merit in as much as it presents a scientifically worked out ideal of Education—namely the ideal of Service to a Perfect Being. It is the only universal ideal that can insure growth and development to the highest degree of excellence. The small treatise now under review deals with the ideals and methods of Islamic Research. Here too Dr. Rafi-ud-Din strikes a new line, which is likely to be illuminating to Muslim scholars and institutions devoted to Research on Islam, but working along the lines laid down by non-Muslim Directors of Research Departments in Western Universities. Western Research sees holes where holes do not exist, re-opens controversies where controversies have long since been closed. It devotes itself to a sort of microscopic examination of words and phrases and has no affective apparatus for an overall view. Naturally it breeds unfaith and scepticism. In the last decade we had ample experience of such stuff being produced in Pakistan.

Dr. Rafi-ud-Din points out that the aim of Research on Islam ought to be to make it intelligible to the modern man and to expose the emptiness of the systems of thought that challange its validity and veracity. It is the bounden duty of Muslim scholars and if they fail therein God will raise some other people that His Will be done. True research should aim at catching the spirit of Islam and communicating it to others, rather than projecting questions and then answering them by hypothetical explanations."

"YAQEEN International", Karachi, July7, 1969.

United HRA 6/69

مقالاتِ شامِ ہمدرد

شامِ ہمدرد کی انجمن میں روشن ہونے والی چند شمعیں ہیں —— جو

مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی —— ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی
ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی —— جسٹس ایس اے رحمان
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی —— مولانا مفتی محمد شفیع
ابوالاثر حفیظ جالندھری —— اے کے بروہی
چودھری نذیر احمد خان —— حکیم عبد اللطیف فلسفی
حکیم محمد سعید دہلوی —— میاں ایم اسلم
جوش ملیح آبادی —— مولانا صلاح الدین احمد
ڈاکٹر برہان احمد فاروقی —— جنرل مجید ملک
مولانا امین احسن اصلاحی —— ڈاکٹر عبد السلام خورشید
حکیم احمد شجاع —— اور —— محمد ولی اللہ خان

جیسے نادرۂ روزگار علماء، ادباء، شعراء، سائنسدانوں، ماہرین تعلیم اور قانون دانوں نے روشن کی ہیں اور جن کی روشنی سے اردو زبان کے آفاق صدیوں تک منور رہیں گے۔
بڑے سائز کے ۳۰۰ صفحات۔ آرٹ پیپر پر ۲۰ تصاویر۔ آفسٹ طباعت

قیمت: کاغذی جلد ۷/۵۰ —— مجلد خاص ۱۵/۰۰

پاکستانی ثقافت کا ایک عظیم الشان منبر

شامِ ہمدرد

جہاں

ہمارے سربرآوردہ اہلِ علم اور اہلِ عمل
تبادلۂ خیال کرتے ہیں ——
اور دانشوروں کی انجمن میں نت نئی
شمع روشن کرتے ہیں ——

مکتبہ جدید

۴- شارع فاطمہ جناح، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

مجوزہ تعلیمی پالیسی

قارئینِ 'میثاق' اچھی طرح جانتے ہیں کہ 'تعلیم' مخدومی ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا خاص موضوع ہے چنانچہ خود 'میثاق' میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی متعدد تحریریں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں — مارشل لا حکام کی جانب سے تعلیمی پالیسی کا جو خاکہ پیش ہوا ہے ذیل کی تحریر میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اس پر مبسوط کلام کیا ہے اور اگرچہ اس میں بہت سی چیزوں میں قارئینِ 'میثاق' کو شاید تکرار و اعادہ کی صورت محسوس ہو۔ تاہم موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کو بصد شکریہ 'میثاق' کے اداریے کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے ——— (اسرار احمد)

مارشل لا حکام کی حقیقت شناسی کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس بات کو خوب سمجھ لیا ہے کہ پاکستان اسلام کے بغیر متحد نہیں رہ سکتا اور اسلام صرف تعلیم ہی کے ذریعہ سے قومی اتحاد کی قوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ حقیقت شناسی ان کی مجوزہ تعلیمی پالیسی سے بالکل عیاں ہے۔ اس پالیسی کی دستاویز میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ملک کا نظامِ تعلیم اسلامی ہو گا اور اسلامی تعلیم کو قومی اتحاد قائم کرنے کے لئے اور پورے ملک میں یکساں قسم کی اسلامی اخلاقی اقدار کو مؤثر بنانے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اسلامی تعلیم قومی اتحاد کا ایک ہی ممکن ذریعہ ہے جسے ہم خاطر خواہ نتائج کا پورا یقین رکھتے ہوئے کام میں لا سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ تشویش ناک اور روز افزوں بے اتفاقی کا سبب

یہی ہے کہ ہم نے اب تک اس ذریعہ کو استعمال نہیں کیا اور اب بھی اگر ہم اس ذریعہ کو بلا توقف اور پوری قوت کے ساتھ استعمال نہیں کریں گے تو پاکستان کا ٹکڑوں میں بٹ کر مٹ جانا یقینی ہے۔ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے ملک کے قومی نظریہ کی حیثیت سے اسلام کا نام بار بار لیا جاتا رہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج سے پہلے ہمارے کسی رہنما نے اسلام کو ملک کے اتحاد کی پرورش کرنے والی اور قومی کردار کو بلند کرنے والی عملی قوت بنانے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔

اسلام کے ساتھ ہمارے لیڈروں کی پیہم منافقت کا نتیجہ آخر کار اس خوفناک قومی انتشار کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا نظارہ ہم نے موجودہ مارشل لا کے نفاذ سے پہلے دیکھا تھا۔ اقتدار کو غلط طریقوں سے قائم رکھنے اور استعمال کرنے کے سلسلہ میں ہمارے ان لیڈروں نے بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا ہوگا۔ لیکن پاکستان کی تاریخ لکھنے والا آئندہ کا مورخ ان کا سب سے بڑا جرم یہی قرار دے گا کہ ان کی ناعاقبت اندیشی نے اسلام کو پس پشت ڈال کر پاکستان کے اندر ایک نظریاتی خلا پیدا کیا جو افراد کی صنفی اور حیوانی خواہشات کو ابھارتا رہا۔ ان کی علاقائی، نسلی اور لسانی عصبیتوں کو مضبوط کرتا رہا۔ اعلیٰ قومی، اخلاقی اور روحانی مقاصد کو نظروں سے اوجھل کرتا رہا اور ایسے غیر ملکی نظریات اور تصورات سے پُر ہوتا رہا جو مجموعی طور پر پاکستانی قوم کے ذوق، مزاج، تاریخ اور روایات کے منافی تھے۔ دوسرے لفظوں میں آئندہ کا مورخ ان کا سب سے بڑا جرم یہ قرار دے گا کہ انہوں نے آفاق گیری کے ولولے رکھنے والی ایک ابھرتی ہوئی نظریاتی قوم کے ولولوں کو سرد کرکے اس کے قالب سے قوت حیات کو سلب کرنے اور اس کے نظریاتی قتل کا ارتکاب کرنے کی کوشش کی تھی۔

تاہم اب مارشل لا حکام کی دانشمندانہ روش سے یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ مارشل لا سے پہلے اسلام ملک کے اتحاد کو قائم کرنے والی ایک زبردست قوت کی حیثیت سے بروئے کار آچکا ہوگا اور مارشل لا اٹھنے کے بعد ملک انتشار کی اس خوفناک آگ کے گڑھے میں دوبارہ نہیں گرے گا جس میں وہ ایک دفعہ گر کر حسن اتفاق سے بچ نکلا ہے۔

اب تک اسلام کو پاکستانی ریاست کے تمام اعمال و افعال بالخصوص تعلیم کی روح بنانے کے راستہ میں جن فرضی رکاوٹوں کا ذکر کیا جاتا رہا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ اب تک اسلام کی وضاحت کوئی نہیں کر سکا۔ آخر ہم کس اسلام کو جاری عمل پہنچائیں اور دوسری یہ کہ اسلام میں کئی فرقے ہیں اگر اسلام یہاں لایا گیا تو وہ کس فرقے کا اسلام ہوگا۔

یہ دونوں اعتراضات قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ یہ یا تو ان لوگوں کے تو ہماتے ہیں جو اسلام

سے ناواقف ہیں اور جن کی تربیت ایسے بے دین نیم علم اور دہریت پسند ماحول میں ہوئی ہے کہ ان کو موقعہ ہی نہیں مل سکا کہ وہ اسلام کو جان سکیں یا سمجھ سکیں۔ یا یہ ان لوگوں کے بہانے ہیں جو اپنی سفلی اور حیوانی خواہشات میں اس قدر غرق ہیں کہ اسلام کے مرد آزما اور مرد آفریں اخلاقی تقاضوں کو اپنے آپ پر نافذ نہیں کر سکتے اور اسلام کی آمد کے خیال سے کانپ جاتے ہیں۔ یا یہ اُن لوگوں کی چالیں ہیں جو دوسرے مذہبوں کے پیرو یا کمیونزم کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور دل ہی دل میں ان کے فروغ کے متمنی ہیں۔ اور یا پھر یہ اُن مغربی دانش وروں کا ہمراہ کن پروپیگنڈا ہیں جو ڈرتے ہیں کہ اگر اسلام ایک سیاسی علمی اور اخلاقی قوت کی حیثیت سے پھر دنیا میں ابھر آیا تو ان کی اپنی تہذیب اس کے سامنے شکست کھا جائے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ صاف اور واضح دین ہے کہ اس کی بنیادی تعلیمات کے بارہ میں کوئی دیانت دار اور واقف حال انسان کسی شک یا الجھن میں نہیں رہ سکتا۔ اور اسلام میں کوئی ایسے فرقے موجود نہیں جو اسلام کی مرکزی اور بنیادی باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں۔

ان دنوں بعض لوگ اسلامی اصولوں کے نفاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول خدا کی محبت اور عبادت ہے یعنی یہ کہ انسان خدا سے محبت کرے، خدا کی ستائش کرے اور اپنے تمام اعمال و افعال کو خدا کی محبت کے تابع بنائے۔ کلمہ توحید اسی اصول کا بیان ہے۔ یہ اصول اسلام کی ابتدا اور انتہا ہے اس لئے بغیر اسلام کی کوئی ہلکی سی ابتدا بھی ممکن نہیں۔ اسلام کے اور تمام اصول اس اصول سے نکلے ہیں اور اسی پر مبنی ہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کی رو سے اسلام کا کوئی اخلاقی یا مذہبی عمل اس وقت تک نہ اخلاقی یا مذہبی عمل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اخلاقی یا مذہبی فائدہ یا ثواب یا قدر و قیمت رکھ سکتا ہے جب تک کہ اس کا کرنے والا اسے اس نیت سے نہ کرے کہ اس کے ذریعہ سے اُسے خدا کی رضا مندی حاصل ہوگی۔ یعنی یہ فعل خدا اور اس کے درمیان محبت کے تعلق کو اور گہرا کرے گا اور اسے اپنے ذاتی اوصاف و فضائل میں خدا سے قریب تر لائے گا۔ اس سے یہ بات آشکار ہے کہ خدا کا تصور اسلام کا مرکزی اور بنیادی اصول ہے۔ اسلام کے تمام فرقے اس اصول پر پوری طرح سے متفق ہیں بلکہ اسلام کے اُن باقی ماندہ چار بڑے اصولوں یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر بھی جو اس سب سے بڑے اور بنیادی اصول سے ماخوذ ہیں متفق ہیں۔ اور باتوں میں مسلمان فرقوں کے مذہبی اختلافات فروعی اور غیر اہم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظریاتی طور پر ایک اسلامی ریاست کی کم از کم ضرورت یہ ہے کہ وہ اسلام سے خدا کا وہ تصور مراد لے جو اسلام نے پیش کیا ہے اور لوگوں کے

فروعی مذہبی معاملات کو جو بہرحال خدا کے تصوّر ہی سے ماخوذ اور متعلق ہوں گے لوگوں پر چھوڑ دے اور پھر ملک کے نظام تعلیم کو خدا کے تصوّر پر قائم کرے تاکہ یہ تصوّر پوری قوم کا موثر اور طاقتور سیاسی اور علمی اور اخلاقی عقیدہ بن جائے اور اس کے بالمقابل تمام دوسرے تصوّرات اور نظریات کمزور اور بے اثر ہو جائیں۔ ایسا کرنے سے وہ اسلامی ریاست فرقہ وارانہ اختلافات سے قطع نظر کرکے اسلام کے تقاضوں کو جماعتی طور پر پورا کرنے اور اپنے آپ کو ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کی سمت میں وہ پہلا اور بنیادی قدم اٹھا سکے گی جس کے بغیر اس سمت میں کوئی اگلا قدم ممکن نہیں ہو سکتا۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی کوئی کامیابی فی الفور حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے اس کو قدم بہ قدم اور بتدریج آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا دوسرا قدم پہلے کے بغیر اور تیسرا دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

خدا کے تصوّر میں کئی خصوصیات ایسی ہیں جو اُسے ایک جدید اسلامی ریاست کے نظام تعلیم میں مرکزی اور محوری مقام پانے کے لئے ناگزیر بناتی ہیں:۔

اوّل: یہ تصوّر انسان کے اعمال کا صحیح مقصود اور مدعا ہے۔ نفسیات انسانی کے جو حقائق حال ہی میں سامنے آئے ہیں اُن سے یہ بات پوری طرح سے ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ ایک ایسے نصب العین کی محبت کا جذبہ ہے جو ہر خوبی اور کمال سے آراستہ اور ہر نقص اور عیب سے مبرّا ہو۔ یہ تصوّر وہی ہے جسے عام انسان خدا کا نام دیتا ہے۔ تاہم جب انسان اپنے جذبہ محبت کے صحیح مقصود کو نہ جانتا ہو تو یہ جذبہ غلط تصوّرات اور نظریات کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سے غلط قسم کے اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ خدا کا تصوّر انسان کو غلط تصوّرات اور نظریات اور غلط اعمال و افعال سے بچاتا ہے اور ان کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے۔

دوم: انسان کی شخصیت حسن کی بھوکی ہے۔ خدا کا تصوّر انسان کے لئے خدا کے اوصاف حسن و کمال کی صورت میں حسن کی غذا بہم پہنچاتا ہے اور انسان کی شخصیت عبادت اور ذکر کے ذریعہ سے نشوونما پاتی اور طاقت اور قوت حاصل کرتی ہے۔ اسی عمل کو تعلیم کہتے ہیں۔ تعلیم انسان کی شخصیت کی نشوونما کا دوسرا نام ہے اور اس نشوونما میں علم کے ساتھ عبادت بھی اپنا کام کرتی ہے۔

سوم: خدا کا تصوّر انسان اور کائنات کے صحیح حکیمانہ اور سائنسی نظریہ کی واحد بنیاد ہے اور لہٰذا سائنس اور فلسفہ کے علوم کی صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔

چہارم: چونکہ خدا ان تمام مظاہر قدرت کا خالق ہے جو سائنس دان کے مشاہدہ اور مطالعہ

کا موضوع ہوتے ہیں اور خدا کی صفات مظاہر قدرت میں آشکار ہیں لہذا مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات اور دلائل ہیں۔ اسی بنا پر خدا کے تصور کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر سائنس کے حقائق کو منظم کرکے اس کا مرکزی تصور بن سکتا ہے اور کسی دوسرے تصور میں یہ خصوصیت موجود نہیں۔

افسوس ہے کہ مغربی سائنس دان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سائنس نہ کسی عقیدہ سے آغاز کرتی ہے نہ کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے لہذا کیسے ممکن ہے کہ خدا کا عقیدہ سائنس میں داخل ہو جائے۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں کہ خدا کا عقیدہ سائنس میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ علم اور عقل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کوئی سائنس دان خدا کے عقیدہ کو سائنس سے الگ رکھے۔

مغربی سائنس دان فقط قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ میں مصروف رہتا ہے اور اسی کو وہ سائنسی عمل سمجھتا ہے اسے معلوم ہی نہیں کہ اس سائنسی عمل کی حقیقت کیا ہے۔ آیا یہ کسی غیر ثابت شدہ اعتقاد پر مبنی ہے یا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے فلسفہ کی کوئی ٹریننگ نہیں ہوتی اور یہی وہ ٹریننگ ہے جو انسان کو کسی چیز کی بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کر سکتی ہے لہذا اگر وہ یہ سمجھے کہ سائنس کسی عقیدہ سے آغاز نہیں کرتی تو اسے معذور سمجھنا چاہیئے کیونکہ مچھلی کبھی نہیں سمجھ سکتی کہ کوئی جاندار ہوا میں بھی زندہ رہ سکتا ہے بلکہ بہترین قسم کا جاندار انسان ہوا میں ہی رہتا ہے۔ لیکن مغربی سائنسدان کو اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے سائنسی عمل کی بنیادوں کی لاعلمی کی وجہ سے پاکستان میں سائنسی تعلیم کے صحیح طریق کار کے اجرا میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اس کا ہر عمل ایک عقیدہ سے آغاز کرتا ہے ورنہ وہ آغاز کر ہی نہیں سکتا۔ مثلاً ہر عمل سے پہلے ہم واضح طور پر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ عمل ہمارے فلاں مقصد کے لئے مفید ہوگا یا اس عمل کو بہترین طریق سے انجام دینے کے لوازمات یہ ہیں۔ سائنسی عمل اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مغربی سائنس اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ :-

> "صداقت وہی ہے جسے ہم اپنے حواس خمسہ سے دریافت کر سکیں۔ جو چیز ہم حواس خمسہ سے معلوم نہیں کر سکتے وہ یا تو موجود ہی نہیں یا اگر موجود ہے تو چونکہ وہ حواس خمسہ سے جانی نہیں جا سکتی وہ معدوم کے حکم میں ہے۔"

مغربی سائنس دانوں نے اسی اعتقاد کی بنا پر خدا کا عقیدہ سائنس سے خارج کیا ہے۔ یہ اعتقاد سائنس سے ثابت شدہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سائنسی عمل کے آغاز سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ اور سائنسی عمل اس کی راہ نمائی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مغربی سائنس دان اپنے سائنسی عمل کو

اس عقیدہ سے آغاز کرتا ہے کہ سائنسی عمل کو کسی عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیئے تو وہ نہ صرف اپنے موقف کی خود تردید کرتا ہے بلکہ اس کو ناقابل عمل ثابت کرتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ درست نہیں۔ کسی شئے کے وجود کو یقینی طور پر جاننے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہم اسے آنکھوں سے دیکھیں بلکہ اس کے اثرات اور نتائج کو آنکھوں سے دیکھ کر بھی ہم اس کے وجود کا یقین کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا یقین کرتے ہیں اگرچہ ہمیں آگ نظر نہ آتی ہو اور مغربی سائنس دان اس اصول پر خود عمل نہیں کر سکا کیونکہ وہ ایٹم کو دیکھے بغیر ایٹم کے اثرات اور نتائج سے ایٹم کے وجود کا اور اس کے اوصاف و خواص کا یقین کرتا رہا ہے۔ ہیروشیما کی تباہی تک ایٹم کو کسی سائنس دان نے خوردبین سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ خدا کو بھی ہم براہ راست نہیں دیکھتے لیکن کائنات میں اس کی تخلیقی سرگرمیوں کو دیکھ کر اس کے وجود اور اس کی صفات کا یقین کرتے ہیں۔ لیکن مغربی سائنس دان صرف خدا کے بارہ میں اس اصول پر عمل کرتا ہے اور خدا کو معدوم کے حکم میں اس لئے رکھتا ہے کہ وہ اسے نظر نہیں آتا۔ سائنس اس لئے ممکن ہوئی ہے کہ مظاہر قدرت میں ہر جگہ نظم پایا جاتا ہے۔ اگر قدرت میں نظم نہ ہوتا تو سائنس ممکن نہ ہوتی کیونکہ سائنس دان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں نظم کہاں کہاں موجود ہے۔ جب وہ ان میں کہیں نظم دریافت کر لیتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اس نے سائنس کا ایک اور انکشاف کر لیا ہے۔ لیکن نظم کیا چیز ہے۔ نظم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کسی ذہن کی تخلیق اور مقصدی کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے ورنہ وہ موجود ہی نہیں ہو سکتا مثلاً اگر ہم مکئی کے چند دانے کہیں بکھرے ہوئے دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اتفاقاً گرے ہوں گے لیکن اگر وہی دانے ایک مکمل دائرہ کی شکل میں یا حروف یا بیل بوٹوں کی صورت میں آراستہ ہوں تو ہم فوراً یہ کہیں گے کہ یہ کسی انسان کے ذہن کا کام ہے۔ اسی طرح سے اگر ہم کسی ایسے جنگل میں چلے جا رہے ہوں جہاں کسی انسان کا گزر مشکل ہو اور اچانک ہی ایک جھونپڑی دیکھ لیں تو ہم فوراً یہ کہیں گے کہ کوئی انسان یہاں پہنچا تھا جس نے یہ بنائی ہے۔ قدرت میں قدم قدم پر ہمیں وہ نظم دکھائی دیتا ہے جو گول دائروں میں حروف میں، بیل بوٹوں کے نقوش میں اور جھونپڑیوں میں موجود ہے۔ مثلاً نظم ایک ایٹم میں، ایک سالمہ میں، ایک خلیہ میں، ایک قلم (کرسٹل) میں، برف کے ایک گالہ میں۔ اجرام فلکی کے نظامات میں ہر جاندار کے جسم میں اور انسانی شخصیت میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس دان قدرت میں نظم دریافت کر کے یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ نظم کس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس سوال کا جواب نہ دینا علم کے ساتھ انصاف نہیں۔ اگر ہم ان سوالات کا جواب نہ دیں جو ہماری علمی جستجو پیدا کرتی ہے تو علم کی ترقیاں رک جاتی ہیں۔ کیا وجہ ہے

کہ مغربی سائنس دان اس سوال سے گریز کرتا ہے اور اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب سوائے خدا کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ جواب مغربی سائنس دان کے حتی صداقت کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے اور اُسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اس سوال کے جواب سے اعراض علمی دیانت داری ہرگز نہیں۔ ٹی ایچ ہکسلے (T. H. HUXLEY) نے سائنس دان کے ضابطہ عمل کا نہایت عمدہ اختصار کیا تھا۔ جب اس نے چارلس کنگسلے (CHARLES KINGSLEY) کو ایک خط میں لکھا کہ :-

"صداقت کے سامنے ایک چھوٹے بچے کی طرح زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھ جاؤ۔ ہر ایسے خیال کو دل سے نکال دینے کے لئے تیار رہو جو پہلے سے دل میں جما ہوا ہو۔ نہایت انکسار کے ساتھ قدرت کے پیچھے پیچھے چلتے رہو خواہ تمہیں وہ کسی گڑھے میں ڈال دے۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو سمجھ لو کہ تم کچھ بھی سیکھ نہ سکو گے۔"

لیکن جہاں تک خدا کے عقیدہ کا تعلق ہے مغرب کا سائنس دان اپنے دل سے یہ خیال نکالنے کے لئے تیار نہیں کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہمارے حواس خمسہ دریافت کر سکیں۔ اگر نظم ہر سائنس کی مرکزی حقیقت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا کا تصور بھی نظم کی تشریح کے طور پر ہر سائنس کی مرکزی حقیقت نہ ہو۔ اگر روس کے لوگ جدلی مادیات کو جو ایک غلط فلسفہ ہے سائنس کا مدار اور مرکز بنا سکتے ہیں تو ہم خدا کے تصور کو جو نظم کی ایک ہی ممکن اور معقول تشریح ہے، سائنس کا مرکزی تصور کیوں نہیں بنا سکتے۔ ان حقائق کی بنا پر مجوزہ تعلیمی پالیسی کے متعلق میری گذارشات حسب ذیل ہیں :-

(۱) اسلامی تعلیم کے معنی یہ نہیں کہ ہم اسلامیات کے ایک مضمون کو آٹھویں جماعت تک نصاب تعلیم میں شامل کر دیں۔ اگر ہم اسلامیات کے علیحدہ مضمون کو ایم اے اور ایم ایس سی کی آخری جماعت تک بھی شامل کر دیں تو اس سے ہمارا نظام تعلیم اسلامی نہیں بن سکتا۔ اسلامی نظام تعلیم وہی ہو سکتا ہے جس میں تمام علوم کی نصابی کتابیں اسلام کے نظریہ انسان و کائنات کے مطابق ہوں۔ چونکہ اسلام کے نظریہ انسان و کائنات کی روح خدا کا تصور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسلامی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابیں اس طرح سے نہ لکھی گئی ہوں کہ خدا کا تصور ان کے مواد کو منظم کرنے والا مرکزی اور محوری تصور ہو۔

مغرب میں جو مختلف علوم کی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اسلامی نظریۂ کائنات کے مطابق نہیں کیونکہ ان کتابوں کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہم حواس خمسہ سے دریافت کر سکتے ہیں

چونکہ یہ اعتقاد درست نہیں اس لئے جو علوم اس اعتقاد کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے ناتمام اور ناقص رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق سب سے بڑی صداقت جو تمام صداقتوں کی ابتدا اور انتہا ہے خدا ہے۔ اگرچہ ہم خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے، تاہم مظاہر قدرت کے اندر جو نظم اور مقصد کے اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم خدا کے تصور کو ایک ایسے معقول علمی تصور کے طور پر قبول کریں جو تمام علوم کی جان ہو۔ علوم کے متعلق مغربی تہذیب اور اسلام کے نقطہ نظر کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسلام مغرب کے ہر علمی موقف کو من و عن تسلیم نہیں کرتا بلکہ ہر علمی مسئلہ کے متعلق اپنے بنیادی تصورات کی روشنی میں اپنی جداگانہ رائے قائم کرتا ہے اور اپنا الگ فیصلہ صادر کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے نزدیک حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ معقول کیا ہے اور نامعقول کیا ہے قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ حکمت کی کتاب ہے اور اس ذات پاک نے نازل کی ہے جو آسمان اور زمین کے اسرار و رموز کو جانتا ہے قل انزلہ الذی یعلم السر فی السموت والارض (اے پیغمبر کہیے کہ اسے اس ذات پاک نے نازل کیا ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کو جانتا ہے) پھر قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دے۔

لیحق الحق و یبطل الباطل (تاکہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے دے) اور وہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ علمی مسائل کے سمیت ان تمام مسائل کے بارہ میں اپنے فیصلے صادر کرے جن میں لوگ اختلافات رکھتے ہیں (یحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (تاکہ ان مسائل میں لوگوں کے درمیان فیصلے صادر کرے جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں)

چنانچہ قرآن حکیم انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ہمیں ایسے تصورات عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن حکیم کے نزدیک علم۔ عقل۔ حکمت۔ سائنس۔ طبعیات۔ حیاتیات۔ نفسیات۔ سیاست۔ فن۔ اخلاق۔ تعلیم۔ اقتصاد۔ قانون۔ تاریخ۔ ارتقا۔ نبوت۔ انسان۔ جبلت۔ نصب العین ایسے موضوعات کے متعلق صحیح نقطہ نظر کیا ہے۔ ان سب موضوعات کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں خدا کا تصور تمام علوم کا محوری تصور ہو۔ اسلامی نظام تعلیم میں بے خدا طبعیات، بے خدا حیاتیات۔ بے خدا نفسیات۔ بے خدا سیاست۔ بے خدا قانون۔ بے خدا اقتصادیات۔ بے خدا تاریخ۔ بے خدا تعلیم اور ایسے اور بے خدا علوم اور لا جیکل پازیٹوزم۔ بی ہیویرزم۔ مارکسزم۔ فرائڈزم۔ ایڈلرزم۔ میکڈوگلزم ایسے بے خدا فلسفے علمی

نظریات کی حیثیت سے پڑھائے نہیں جا سکتے، بلکہ صرف ان کی منطقی اور عقلی غلطیوں کو سمجھانے کے لئے پڑھائے جا سکتے ہیں، کیونکہ ان علوم اور نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح سے جب کوئی علم نظریہ خدا کے تصور سے الگ ہو کر وجود میں آتے تو اس میں عقلی اور منطقی خامیاں اور ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم ایسے نظریات کی خامیوں اور ناہمواریوں کو دریافت کر کے آشکار کرتا ہے۔

تہذیب مغرب کے اس بنیادی عقیدہ نے کہ صداقت وہی ہے جسے ہم حواس خمسہ سے دریافت کر سکیں اور خدا ایک ایسی صداقت نہیں جتنا بڑا اثر انسانی اور سماجی علوم مثلاً فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ اقتصاد، فلسفہ تاریخ، فلسفہ نفسیات فرد اور فلسفہ نفسیات جماعت، فلسفہ علم اور فلسفہ فن وغیرہ پر ڈالا ہے اتنا طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم پر نہیں ڈالا۔ طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم میں تو پھر بھی مغرب کے سائنس دان بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کے مدعی ہیں (اگرچہ وہ کامیابیاں ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں جو ان علوم میں خدا کے تصور کو داخل کرنے سے انہیں حاصل ہو سکتی ہیں) لیکن انسانی علوم میں وہ اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اعتراف دور دور کرتے ہیں۔ ان علوم میں ان کی بے مائیگی کا سبب یہ ہے کہ خدا کے اسلامی تصور کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کائنات کا خالق ہے اور اس کی ذات اور صفات مظاہر قدرت کے اندرونی نظم اور مقصد میں آشکار ہیں اور دوسرا یہ کہ انسان سراسر خدا کی محبت کا ایک جذبہ ہے اور یہی جذبہ اس کے تمام اعمال و افعال کی قوت محرکہ ہے۔ اگر اس تصور کا یہ دوسرا پہلو بھی صحیح ہے جیسا کہ درحقیقت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تصور کی روشنی کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا ماہر فطرت انسانی بھی اعمال انسانی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اور ان کے معقول اور مدلل اور قابل فہم فلسفے (جن کو انسانی اور سماجی علوم کہا جاتا ہے) مدون نہیں کر سکتا۔ مغرب کے لوگ چونکہ اپنی تہذیب کے حسیّ صداقت کے بنیادی عقیدہ کے زیر اثر اور اس کلیدی تصور کی روشنی کے بغیر ان علوم کو مدون کر رہے ہیں لہٰذا ناکام اور نامراد رہے ہیں۔ لیکن وہ بدقسمتی سے اب بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر وہ ان علوم کی طرف زیادہ توجہ کریں تو وہ اس تصور کی روشنی کے بغیر ان علوم کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی کر سکیں گے۔ مغرب کا ایک ماہر نفسیات سکنر (SKINNER) لکھتا ہے :-

"سائنس کی ترقی بغیر متوازن طور پر ہوتی ہے۔ آسان مسائل کو پہلے گرفت میں لے لینے کی وجہ سے اس نے بے جان قدرت پر ہمارا تصرف بڑھا دیا ہے لیکن سماجی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا جو اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہو سکتے تھے ...... یہ جان

قدرت کی سائنس کو ترقی دینے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ اس کے اندر فطرت انسانی کی سائنس بھی بڑی مقدار میں شامل نہ ہو کیونکہ اسی صورت میں اس کے حاصلات دانش مندی کے ساتھ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔" (سائنس اور انسانی کردار"۔ سکنر)

مغرب کا ایک اور ماہر نفسیات میکڈوگل اپنی کتاب "عالمی انتشار" میں لکھتا ہے :-

"فطرت انسانی کے بارہ میں ہماری لاعلمی اب تک تمام انسانی اور اجتماعی علوم کی ترقی کے لئے سدراہ بنتی رہی ہے اور اب بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک شدید ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ شاید مکمل تباہی کے شدید خطرہ کا سامنا کر رہی ہے۔ ہم علم نفسیات کا، علم اقتصادیات کا، علم سیاسیات کا علم قانون کا، علم صحافت کا اور اس کے علاوہ اور بہت سے فرضی علوم کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دل کش نام فقط ہمارے علم کے خلاؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فقط ان وسیع و عریض بیآباد صحراؤں کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی سیاحت ابھی تک نہیں کی گئی لیکن یہ صحرا وہ ہیں کہ اگر ہماری تہذیب نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ان کو کسی قاعدہ کے تحت لانا ہی پڑے گا۔

میرا دعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے توازن کو بحال کرنے کے لئے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کا علم (منظم کیا ہوا، اکٹھا کیا ہوا علم یا سائنسی علم) اس سے بہت زیادہ درکار ہے جو ہمیں اب تک حاصل ہوا ہے۔

لہٰذا یہ ہے وہ ایک ہی طریق کار جس سے ہم اپنی تہذیب کی موجودہ غیر یقینی اور دن بدن زیادہ خطرناک ہوتے والی حالت کا مداوا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انسانی اور اجتماعی علوم کو صحیح پیمانے کے علوم کی شکل دینی چاہیئے۔

انسانی اور اجتماعی علوم کی بنیاد دریافت کرنے اور ان کے طریق ترتیب و تدوین کو مہیا کرنے کی ضرورت آج اتنی شدید ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی، تو پھر عملی نقطہ نظر سے علاج کیا ہوا میں اپنے جواب کو مختصر طور پر پیش کرنے کے لئے یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ایک ڈکٹیٹر ہوتا تو کیا کرتا..... میں ہر ممکن طریق سے اس بات کی کوشش کرتا کہ ہمارے بہترین دماغوں کو طبعیاتی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم میں تحقیق کے کام پر لگا دیا جائے۔

(ورلڈ کیاس صفحات ۹، ۵۹، ۱۱۲، ۱۱۵) "WORLD CHAOS"

میکڈوگل انسانی اور اجتماعی علوم کو نئے سرے سے لکھ کر مغربی تہذیب کو متوقع زوال سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ وہ یہ اندازہ کر رہا ہے کہ مغربی تہذیب کا زوال کسی نہ کسی طرح سے ان علوم کی ابتر حالت کے ساتھ متعلق ہے تاہم اسے معلوم نہیں کہ ان علوم کو کس طرح سے بدلا جائے کہ ان کے ذریعہ سے مغربی تہذیب کا زوال رک جائے۔ لیکن مغرب کا ایک اور نامور مفکر ہمیں بتاتا ہے کہ مغربی تہذیب کے زوال کا سبب یہ ہے کہ اس تہذیب نے غلطی سے اپنا بنیادی عقیدہ یہ قائم کیا کہ صداقت صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہم اپنے حواس سے [illegible] اور اس طرح سے خدا اور روح کے تصورات کو اپنے علوم سے خارج کر دیا اور یہ تہذیب زوال سے نہیں بچ سکتی جب تک کسی روحانی عقیدہ کو اپنی بنیاد نہ بنائے۔ اس مفکر کا نام پٹی رم سوروکن (PITIRIM SOROKIN) ہے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کا پروفیسر رہا ہے اور جس کو امریکی رسالہ "سوشیالوجی اور سوشل ریسرچ" عہد حاضر کا سب سے بڑا عبقری قرار دیتا ہے۔ سوروکن اپنی کتاب "ہمارے دور کا بحران" میں لکھتا ہے کہ مغربی تہذیب ایک المناک بحران تک پہنچ گئی ہے جو عنقریب اس کی تباہی کا موجب ہو گی اور یہ تباہی دولت حاضر کے انسان کے لئے ذلت کا پیغام اپنے ساتھ لائے گی۔ وہ لکھتا ہے کہ مغربی تہذیب کے اس بحران کا سبب یہ ہے کہ :

"وہ اس عقیدہ کی بنا پر وجود میں آئی تھی کہ سچی نیکی اور سچی صداقت دونوں کلیتہً یا بیشتر حسی اور مادی ہیں۔ ہر وہ چیز جو حواس خمسہ کی گرفت سے بالا ہے بطور صداقت کے فرضی ہے یا تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں یا اگر کوئی وجود ہے تو چونکہ وہ حواس خمسہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا وہ غیر موجود کے حکم میں ہے۔ چونکہ سچی صداقت یا سچی نیکی کو مادی یا حسی قرار دے لیا گیا تھا۔ ہر وہ چیز جو حواس کے ادراک سے ماوراء تھی خواہ وہ خدا کا تصور تھی یا انسان کا شعور ہر وہ چیز جو غیر حسی یا غیر مادی تھی اور جو روزمرہ کے تجربہ میں دیکھی سنی چھوئی یا سونگھی نہیں جا سکتی، ضروری تھا کہ اسے غیر حقیقی، غیر موجود اور بے سود قرار دیا جاتا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس شجر کاری کا پہلا زہر آلود پھل یہ تھا کہ سچی صداقت اور سچی نیکی کے دائرہ کو ایک حد تک محدود کر دیا گیا اور جب تہذیب ایک بار اس راستہ میں داخل ہو گئی تو پھر اس کو اسی راستہ پر آگے جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صداقت اور نیکی کی دنیا ہر روز اور زیادہ حسیت اور مادیت کے تنگ سانچوں

ہیں ڈھلتی گئی ہے"

سوروکن آخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دور حاضر کی حسیت زدہ تہذیب کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ اپنے حسیت نواز بنیادی عقیدہ کو بدل کر اس کی جگہ کسی روحانی عقیدہ (یعنی خدا) کو اپنی بنیاد بنائے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہی

"حسیت زدہ تہذیب کے تمام مفروضوں اور تمام قدروں کا نئے سرے سے گہرا مطالعہ کیا جائے اس کی خارج از وقت کاذب اقدار کو رد کیا جائے اور ان سچی قدروں کو بحال کیا جائے جو اس نے رد کر دی ہیں ۔۔۔۔ مذہب اور سائنس کا موجودہ افتراق حد درجہ تباہ کن ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر سچی صداقت اور سچی نیکی کے معقول اور تسلی بخش نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ قادر مطلق خدا کی صفات کو اس مرئی دنیا کے اندر آشکار کیا جائے تاکہ خدا کے نام کا بول بالا ہو اور انسان کی عظمت پایہ ثبوت کو پہنچے۔"

اب قابل غور بات یہ ہے کہ آیا ہمارے لئے مناسب ہے کہ مغرب کے اُن انسانی اور اجتماعی علوم کو اپنی یونیورسٹیوں میں پڑھائیں جن کو خود مغرب کے لوگ علوم کا درجہ نہیں دیتے اور ان کو بدلنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی تہذیب مٹنے سے بچ جائے۔ کیا ان علوم کو اپنا کر ہم خود مٹنے کی راہوں پر نہیں چلیں گے۔ نہیں چاہئیے کہ ہم اس زہر سے پرہیز کریں جس سے مغربی تہذیب مر رہی ہے اور مغرب کے حسی صداقت کے عقیدہ کو رد کر کے تمام طبیعیاتی حیاتیاتی اور انسانی علوم کو نئے سرے سے اس طرح سے لکھیں کہ خدا کا عقیدہ ان کا مدار و مرکز بن جائے۔ ان علوم کی نصابی کتابوں میں خدا کے عقیدہ کو اپنے مقام پر لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مغرب میں ایسا نہیں کیا گیا۔ لیکن اب مغرب کے لوگ منتظر ہیں کہ ایسا کیا جائے لہٰذا اب یہ رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی۔ مغرب کا ایک نامور فلسفی فیلڈ مارشل سمٹس جس نے ہولزم کے نام سے فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب لکھی ہے کہتا ہے :-

"یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ سائنس ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شاید خدا کی ہستی کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ یقیناً مستقبل میں نوع انسانی کے لئے کرنے کے بڑے بڑے کاموں میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ جوڑے اور اس طرح اس مہیب خطرہ کا سدباب کرے جو ہماری تہذیب کے مستقبل کو درپیش ہے۔"

(۲) اسلامی نظام تعلیم میں اسلامیات کا مضمون الگ بھی پڑھانا ضروری ہے۔ لیکن ہمیں چاہیئے کہ ہم اس مضمون کی نصابی کتابوں کو اس طرح سے تیار کریں کہ وہ تمام اسلامی احکام کی (جن میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ بھی شامل ہیں) اور اسلامی ضابطہ اخلاق کی دل نشین وضاحت کرنے کے علاوہ اسلام کو ایک نظریۂ کائنات کے طور پر اس طرح سے پیش کریں کہ زمانہ حال کا انسان جو بہرا عتقاد اور عمل کی عقلی اور علمی توجیہہ چاہتا ہے اس سے پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ اسلامیات کے طالب علم کے لئے اس زمانہ میں ان دو سوالات کا تشفی بخش جواب معلوم کرنا حد درجہ ضروری ہے۔

(۱) انسان کو مذہب کی ضرورت کیوں ہے۔

(۲) صرف اسلام ہی وہ مذہب کیوں ہے جو انسان کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اسلام کا فلسفہ ہمارے پاس اس شکل میں موجود ہے کہ ہم اس کی روشنی میں اسلامیات کی اس قسم کی کتابوں میں اسلام کو ایک عقلی اور علمی نظریہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان دو سوالوں کا نہایت ہی تسلی بخش جواب دے سکتے ہیں۔

(۳) اگر ہم نے اسلامی تعلیم کو ملک کے اتحاد کا ایک ذریعہ بنانا ہے جیسا کہ مجوزہ تعلیمی پالیسی میں بڑی دانش مندی سے تجویز کیا گیا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم لفظ تعلیم کے مفہوم کو وسعت دے کر اس میں نہ صرف یونیورسٹی کالج اور سکول کی تعلیم کو بلکہ اس تعلیم کو بھی شامل کریں جو اور ذرائع سے انسان اور کائنات کے متعلق پاکستانی فرد کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان ذرائع میں مطبوعہ مواد (اخبارات، رسائل اور کتابیں) خواہ وہ ملک کے اندر تیار کی گئی ہوں یا باہر سے آئی ہوں اور پبلک جلسوں میں ہونے والی تقریریں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام اور غیر ملکی یا ملکی فلمیں شامل ہیں۔ اگر ہم ان ذرائع تعلیم کو اسلام کی واقفیت اور محبت پیدا کرنے کے لئے استعمال نہ کریں گے تو وہ کسی نہ کسی رنگ میں لازماً اس مقصد کے خلاف معرض عمل میں آئیں گے اور قومی اتحاد پیدا کرنے کی اس کوشش کو بہت حد تک کالعدم کر دیں گے جو یونیورسٹی، کالج اور سکول کی طرف سے ہو رہی ہو گی۔

یہ تجویز مجوزہ تعلیمی پالیسی کی اس تجویز کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس کے مطابق غیر ملکی مشنری تعلیمی اداروں کو اس لئے قوم کے حوالے کیا جا رہا ہے کہ وہ ایسے خیالات کی تلقین کرتے ہیں جو اسلامی اقدار کے خلاف ہیں۔ اگر ہمارے اتحاد کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اسلام پر ہمارا مشترک عقیدہ مضبوط اور پختہ ہو تو ظاہر ہے کہ ہر وہ عمل جو اس عقیدہ کو کمزور اور مضمحل کرتا ہے خواہ وہ غیروں سے سرزد ہو یا اپنوں سے ہمارے اتحاد پر ایک ضرب لگاتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ایسی ضربات کو صرف

ایک یا دو طرف سے نہیں بلکہ ہر طرف سے روک دیں۔ اگر ہم اپنے نظریاتی جہاز کے ایک درجن سوراخوں کو بند کرنے کے بعد ایک سوراخ کو بھی کھلا چھوڑ دیں گے تو ہمارا جہاز منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔

(۴) تعلیم کے انتظام کو مرکز سے ہٹا کر پاکستان کے سارے علاقوں میں ماتحت اداروں کے سپرد کرنا اور بعض کالجوں کو اپنی درسی کتابیں خود مقرر کرنے کی اجازت دینا ہماری اس خواہش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا کہ ملک کو تعلیم کے ذریعہ سے اسلامی نظریہ حیات پر متحد کیا جائے اور پورے ملک میں ایک ہی قسم کی اسلامی اخلاقی قدروں کو نافذ کیا جائے۔ کسی ریاست کا نظریہ اس کی قوت حیات یا روح یا جان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس قدر کسی ریاست کے افراد اپنے نظریہ سے زیادہ محبت رکھتے ہوں، اسی قدر زیادہ وہ ریاست متحد اور منظم اور طاقتور ہوتی ہے اور جس قدر زیادہ نظریہ کے لئے ان کی محبت کمزور ہوتی جاتی ہے اسی قدر زیادہ ریاست بھی افتراق اور انتشار کا شکار ہو کر کمزور ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر کار صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ چونکہ نظریہ کی محبت کی نشو و نما کا دار و مدار فقط تعلیم پر ہے لہٰذا تعلیم ریاست کی حفاظت کا کام کرتی ہے اور اس لحاظ سے اسے فوج اور اسلحہ کی طرح ریاست کے حفاظتی اور مدافعتی نظام کا ایک جزو قرار دینا چاہیئے۔ جس طرح سے ہم ملک کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے پیش نظر لاہور یا پشاور کے نوجوانوں کو آزادی نہیں دے سکتے کہ وہ اپنی فوج پیدا کر کے اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں اسی طرح سے ہم ملک کی نظریاتی حدود کی حفاظت کے پیش نظر لاہور یا پشاور کے کسی کالج یا کسی یونیورسٹی کو آزادی نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے ارد گرد کے علاقہ کے طلبا کے لئے اپنی درسی کتابیں خود مقرر کریں۔ اگر پاکستان کے ہر کالج میں درسی کتابیں ایک نہ ہوں تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی کہ تعلیم محدود مقامی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یا علاقائی نظریات اور تعصبات کو فروغ دینے کے لئے یا سندھی، بنگالی، افغانی اور پنجابی قومیتوں کے جذبات کو ابھارنے کے لئے استعمال نہ کی جائے گی اور اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ ہوگی کہ تعلیم کا معیار ہر جگہ یکساں اور بلند رہے گا۔ تعلیم کے منتشر ہونے سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ ریاست ایک نظریہ پر متفق ہونے کی بجائے مختلف نظریات میں بٹ جائے گی بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تعلیم کا معیار ایک نہ رہے گا اور مناسب سطح سے گر جائے گا۔ روس اور چین کی موجودہ نظریاتی ریاستوں نے بلکہ زمانہ ماضی میں بھی دنیا کی کسی نظریاتی ریاست نے اپنی تعلیم کو کبھی مرکز سے ہٹا کر علاقائی انتظام کے ماتحت نہیں رکھا اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے نہ ملک کی نظریاتی وحدت قائم رہ سکتی ہے اور نہ تعلیمی معیار کو وہ یکسانیت اور رفعت میسر آ سکتی ہے جس کی ایک نظریاتی ریاست

کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں کا کوئی واضح نظریہ حیات نہیں لہٰذا ان کے ہاں تعلیم مرکز کے ماتحت نہیں بلکہ ہر ریاست کا اپنا اہتمام ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب امریکہ کے لوگوں کو بھی اس بات کا احساس کرنا پڑا کہ یہ صورت حال غلط اور ضرر رساں ہے۔ جب روس نے اپنا پہلا سپٹنک مدار میں چھوڑا تو امریکہ کے لوگ ششدر رہ گئے اور ان کو خیال پیدا ہوا کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں روس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ سٹینفورڈ یونیورسٹی کیلی فورنیا کے پروفیسر تعلیمات پال اے حنا (PAUL A HANNA) نے کہا کہ اس میدان میں امریکہ روس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ امریکی تعلیم مرکز کے ماتحت نہیں اور ہر ریاست اُسے اپنے محدود مقامی حالات اور مقاصد کے مطابق ڈھالتی ہے اور مجموعی قومی مقاصد کو ملحوظ نہیں رکھتی لہٰذا تعلیم کو مرکز کی تحویل میں دینا چاہیئے اس پر ریاستوں کے لوگوں نے اس کی بہت مخالفت کی اور اس کی تجویز کو ریاستوں کی آزادی کے منافی قرار دیا تاہم چونکہ اس کی بات درست تھی۔ کانگرس کے بعض دور اندیش اراکین نے آئزن ہاور کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کی۔ بحث و تمحیص کے بعد آخر کار ایک قانون منظور کیا گیا جس کا نام نیشنل ڈیفنس ایکٹ تھا۔ اس قانون کی رو سے قرار پایا کہ قومی نقطہ نظر سے امریکہ کے تمام کالجوں اور سکولوں کے لئے ایک نصاب تیار کیا جائے اور جو تعلیمی ادارہ اس نصاب کو اپنائے اُسے مرکز کی طرف سے وافر رقوم بطور گرانٹ کے دی جائیں۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ لوگ روس سے پہلے چاند پر اترے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں نے نصاب تعلیم کی مرکزیت اور وحدت کو جس قانون سے نافذ کیا اُسے نیشنل ڈیفنس ایکٹ کا نام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ تعلیم کی مرکزیت اور وحدت ملک کی مدافعت اور حفاظت کے لئے ضروری ہے۔

اس موضوع پر

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے حسب ذیل مضامین میثاق میں شائع ہو چکے ہیں۔

- سائنس کی بے خدائیت کے خلاف اقبالؒ کا جہاد — ستمبر ۱۹۶۸ء
- صحیح نظام تعلیم اور پاکستان — اکتوبر "
- اسلام اور سائنس — مارچ ۱۹۶۹ء
- پاکستان کی وحدت و سالمیت کی ضروری شرط : اسلامی تعلیم — جولائی "
- ہمارے سائنس کی موجودہ درسی کتابوں کے نقائص — اگست "

(مینیجر)

ماهنامه میثاق لاهور

قواعد و ضوابط

- میثاق ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہونی چاہیئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جائے گا۔
- ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے • پرچہ صرف بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔
- کمیشن ۲۵ فی صد۔ محصول ڈاک بذمہ میثاق
- قیمت فی پرچہ ایک روپیہ • سالانہ زرمبادلہ دس روپے

مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک بیس روپے

نرخنامہ اشتہارات

- ٹائیٹل کا آخری صفحہ ۵" × ۷" ۱۵۰ روپے
- ٹائیٹل کے اندرونی صفحات ۵" × ۷½" ۱۲۵ روپے
- اندرونی صفحات فی صفحہ ۱۰۰ روپے نصف صفحہ ۷۵ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

ہم سے طلب فرمائیں

تصانیف علامہ سید محمود احمد عباسی

حقیقت خلافت و ملوکیت

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیف: خلافت و ملوکیت کا مسکت جواب مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

سائز ۲۳×۳۶/۱۶ صفحات ۵۶۸ مجلد

قیمت قسم اول سفید کاغذ مع ڈسٹ کور -/۱۱ روپے

" دوم نیوز پرنٹ ۶/۷۵ "

تحقیق مزید

بہ سلسلہ خلافت معاویہؓ و یزیدؒ

بڑی تقطیع

صفحات ۴۰۰ مجلد

قیمت: آٹھ روپے

(محصول ڈاک اس کے علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

تدبرِ قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر

سورۂ انعام

(۸)

۱۷۔ آگے کا مضمون آیات ۱۰۹ تا ۱۱۷

اوپر کے مجموعۂ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، تفصیل کے ساتھ توحید، معاد اور رسالت کے عقلی و فطری دلائل بیان ہوئے۔ اب آگے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سارے دلائل کے بعد بھی ان کا مطالبہ یہی ہے کہ تم کوئی معجزہ دکھاؤ تو وہ ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ چیز میرے اختیار کی نہیں ہے، صرف خدا کے اختیار کی ہے۔ اس کے پاس معجزات کی کمی نہیں ہے، وہ ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دکھا سکتا ہے لیکن تم دنیا جہان کے معجزے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے اس لئے کہ ایمان نہ لانے کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ نشانیاں اور معجزات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ تمہارے دل اور تمہاری آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر تم اندھے ہی بنے رہے اسی طرح اگر اور بہت سے معجزے بھی تمہیں دکھا دیے گئے جب بھی تم اندھے ہی بنے رہو گے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس دنیا میں جاری ہے اور جس سے ہر نبی اور ہر داعیٔ حق کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی نبی یا کسی داعیٔ حق کی دعوت حق بلند ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کے لئے شیاطین انس و جن بھی لازماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو اہلِ حق کی آزمائش اور ان کے کھرے کھوٹے میں تمیز ہوتی ہے، دوسری طرف اہلِ باطل کو ڈھیل ملتی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح

بجا لیں اور جو کمائی انہیں کرنی ہے کر لیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میرے لئے تو اس قضیہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب اتار کر حق اور باطل کے درمیان واضح فیصلہ کر دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ اب جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ان کے باب میں خدا کی وہ بات پوری ہو کے رہے گی جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمائی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تلقین اور معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کی تلقین ہے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ
بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا
بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰ وَلَوْ اَنَّنَا
نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا
مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝۱۱۱
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ
مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۱۲ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ
مُّقْتَرِفُوْنَ ۝۱۱۳ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ
اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ
اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۱۱۴
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۱۵ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۱۱۶

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمہیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے۔ اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے لیکن ان کی اکثریت مبتلائے جہل ہے۔ ۱۰۸ - ۱۱۱

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پر فریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کے لئے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی اپنی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انہیں کرنی ہے وہ کریں۔ ۱۱۲ - ۱۱۳

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری مفصل۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جیو۔ اور تمہارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمہیں خدا کے راستہ سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کے رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱۱۶ - ۱۱۷

۱۸- الفاظ و اسالیب اور جملوں کی وضاحت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ لَئِنْ جَآءَتْہُمْ اٰیَۃٌ
لَّیُؤْمِنُنَّ بِہَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا یُشْعِرُ
کُمْ اَنَّہَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَہُمْ
وَاَبْصَارَہُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُہُمْ
فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃَ
وَکَلَّمَہُمُ الْمَوْتٰی وَحَشَرْنَا عَلَیْہِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوْا
لِیُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ یَجْہَلُوْنَ ۱۰۹-۱۱۱

واقسموا باللہ جہد ایمانہم لئن جاءتہم آیۃ لیؤمنن بہا۔ 'جہد' کے معنی تاحد وسع کوشش، بھرپور جدوجہد کے ہیں۔ 'بذل جہدہ' اس نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ پورا زور لگا دیا۔ 'اقسموا باللہ جہد ایمانہم' یعنی وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر پیغمبرؐ کو اور مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور مان لیں گے کہ یہ معجزہ خدا کی طرف سے، اس کا دکھانے والا خدا کا رسول اور اس کی پیش کردہ کتاب خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زور شور کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے سے اصل مقصود ان کا وہ تو تھا نہیں جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ یہ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک پروپیگنڈا تھا۔ وہ اس سے ایک طرف تو اپنے ان ہم قوموں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے متاثر ہو رہے تھے کہ ہم نے ایک شرط پیش کر دی ہے جو نہایت معقول ہے، اگر یہ شرط محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کر دیں تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف وہ نیک دل مسلمانوں کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ جب یہ سچے رسول ہیں تو آخر اس شرط کے مان لینے میں کیا مانع ہے، کیوں نہیں اس کو مان کر میدان جیت لیتے؟

قل انما الآیت عند اللہ وما یشعرکم انہا اذا جاءت لا یومنون۔ یہ جواب ہے ان کی پیش کردہ شرط کا اور دیکھیے کتنا نازک موقع ہے لیکن جواب وہی دیا گیا جو بالکل صحیح جواب ہے، ذرا بھی اس میں اس اندیشے کا دخل نہیں ہے کہ اس کو سن کر حریف تالی پیٹ دے گا کہ یہ لو، فتح ہماری ہے۔ خود پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ

کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں، وہ چاہے تو ظاہر فرمائے، نہ چاہے تو نہ ظاہر فرمائے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے۔ پیغمبر کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے، نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

'وما یشعرکم' میں ضمیر خطاب جمع کی ہے اور روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ قدرتی طور پر بحث کی اس گرما گرمی کے دور میں ان کے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ جب بات اسی شرط پر آ کر ٹکی ہے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے تو ان کو کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ بدستور اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے اس لئے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی جو اصل علت ہے وہ بدستور اس معجزے کے دیکھ لینے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

'ونقلب افئدتھم وابصارھم کما لم یومنوا بہ اول مرۃ'

یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے۔ اس سنت اللہ کی وضاحت اس کتاب میں مختلف مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جو ان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرز جاں بناتے ہیں ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں مگن رہتے ہیں، قرآن اور پیغمبر کی بار بار کی تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کے دل اور ان کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف 'فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم' میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنۃ اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے

باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کئے جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے وہ کل کس طرح دور ہو جائے گا اور جو اندھاپن آج دیکھنے سے مانع ہے وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں اسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو وہی قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔ یہ قلب ماہیت چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آتی ہے اس وجہ سے جس طرح بعض مواقع میں فعل 'اضلال' کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح یہاں تقلیب قلوب و ابصار کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ 'بہٖ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

'ونذرھم فی طغیانھم یعمھون'۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز جو ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے وہ ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھے بیٹھے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے عزور نفس اور ان کے پندار سیادت پر شاق گزر رہی ہے۔ ان کے اس عزور کی سزا ان کو یہ ملی ہے کہ ان کے دل اور ان کی آنکھیں خدا نے الٹ دی ہیں اور ان کو اسی عزور میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

'ولو اننا نزلنا الیھم الملٰئکۃ وکلمھم الموتٰی وحشرنا علیھم کل شیٔ قبلا ما کانوا لیومنوا'۔ 'قُبُل' مصدر بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی شے کو سامنے سے آتے دیکھنے کے ہیں اور 'قبیل' کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں معنوں کے لئے نظیر موجود ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر سورہ کہف میں ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰی وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّھُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَھُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۵۵ (ہدایت آ چکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت چاہنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان کے بارے میں بھی خدا کی وہی سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے بارے میں ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ ان پر عذاب سامنے سے در آتا ہوا آ جائے) دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اوتاتی باللہ والملٰئکۃ قبیلا ۹۲ (یا تم لاؤ اللہ کو اور فرشتوں کو گروہ در گروہ)

قبل کی تحقیق

زیر بحث آیت میں اگرچہ یہ دونوں معنی ہیں لیکن میں نے 'حشرنا' اور 'کل شئی' کی رعایت سے ترجمے میں ترجیح دوسرے معنی کو دی ہے۔

ایمان کے لیے اصل حجاب

یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں، یا قبروں سے مردے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگتے جیسا کہ یہ مطالبہ کرتے ہیں یا یہ وہ غیب کی ساری ہی چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ لاکھڑی کرتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ طغیان جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جب بھی باقی رہتا۔

ایمان کے بارے میں سنت الٰہی

'الا ان یشاء اللہ ولکن اکثرھم یجھلون'۔ ان کے ایمان لانے کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ ان کو ایمان و ہدایت بخشے اور اللہ کا کوئی چاہنا بھی اس کی ٹھہرائی ہوئی سنت اور اس کی پسند فرمائی ہوئی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ایمان و اسلام کسی کے دل میں زبردستی نہیں ٹھونستا۔ یہ نعمت وہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے قدر دان ہوتے ہیں اور اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو خدا نے ان کے اپنے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ جب وہ ان کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو مزید توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ رہے یہ جو معجزے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو یہ اپنی خواہشات و جذبات کے غلبہ سے اندھے ہو رہے ہیں۔ ان کے لئے یہ راہ کیسے کھل سکتی ہے؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ
رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ
اَفْـــِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا
مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۔ ۱۱۲-۱۱۳

انبیاء کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت ابتلا

'وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن' 'کذٰلک' کا اشارہ اس مخالفانہ شورش کی طرف ہے جو اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں اور ان کے ہمنواؤں نے برپا کر رکھی تھی۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اس صورت حال سے تنہا تمھی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تم سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کو بھی اپنے اپنے زمانوں کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں یہی دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی سنت ابتلا ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے۔ اسی سے راستبازوں کی راست بازی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے جوہر نکھرتے ہیں اور اسی سے اہل باطل کو وہ مہلت ملتی ہے جس میں ان کے اندر کا فساد ظہور میں آتا ہے اور وہ اپنے اد پیمانہ

اللہ کی حجت تمام کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے اسی سورہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔ وکذالک جعلنا فی کل قریۃ اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون ۱۲۳ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی کے اکابر مجرمین کو مہلت دی کہ وہ جو چالیں اس میں چلنا چاہتے ہیں چل لیں، اور وہ نہیں چلتے مگر کوئی چال مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا) اہل ایمان کی یہ آزمائش اور اہل کفر کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانون ابتلا کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے اختیار و ارادہ کی جو آزادی بخشی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے، اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔

'یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا' 'زخرف' کے معنی ملمع کی ہوئی بات، جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہو گئی ہے۔ اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن و انس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر ان کے اوپر شریعت الٰہی کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا اور جب انبیاء و مصلحین نے ان کی اصلاح کی دعوت دی تو ان کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور ان کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور چلا اس کو اپنے دام فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیمؑ کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ شرک اور باطل کا جتنا نظام بھی ہے وہ تمام تر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیاطین جن و انس کے باہمی گٹھ جوڑ سے قائم ہے۔ یہ بات تفصیل سے اپنے مقام میں واضح ہو چکی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد عقیدۂ توحید سے ہے اس وجہ سے وہ اس پر ضرب لگانے کے لئے برابر نت نئے حربے اور نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے جو اس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کے اندر غلط عقائد القا کر کے ان کے واسطے سے خلق خدا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون ۱۲۱ (انعام)
(اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو

تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔) اس گٹھ جوڑ کی مزید وضاحت آگے کی ایک اور آیت سے بھی ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ ویوم یحشرھم جمیعا یامعشر الجن قد استکثرتم من الانس وقال اولیائھم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض و بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا۔ ۱۲۸۔ انعام (اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا اور کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو ہتھیا لیا اور جو انسانوں میں سے ان کے ساتھی بنے ہوں گے وہ بولیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو استعمال کیا یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے اس مدت کو جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرائی ہوئی تھی)

ولو شاء ربک ما فعلوہ فذرھم وما یفترون۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مشیت اور اس کے قانون امتحان و آزمائش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس نے انسانوں اور جنوں کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ سب کو نیکی ہی کی راہ پر چلانا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملے میں جبر کے بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ اس قانون کے تحت باطل کے علمبرداروں، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بھی اس حیات چند روزہ میں مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی انتخاب کی ہوئی راہ پر چلیں۔ تو تم اپنی راہ چلو اور لوگوں کو اسی راہ کی دعوت دو اور ان لوگوں کو جو تمہاری بات سننا نہیں چاہتے ان کی من گھڑت بدعات میں پڑے رہنے دو۔ یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ لفظ 'افتراء' پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے شرک اور مشرکانہ بدعات مراد ہوتی ہیں۔

ولتصغیٰ الیہ افئدۃ الذین لایؤمنون بالآخرۃ ولیرضوہ ولیقترفوا ما ھم مقترفون۔ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے۔ یعنی ہم نے شیاطین جن و انس انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لئے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے، دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ ان شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی انہیں کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے اس وجہ سے یہ سنت الٰہی

کے تحت ہے۔ ان لوگوں کی صفت یہاں 'الذین لا یومنون بالآخرۃ' بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین و اشرار کی یہ دعوت انہی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ 'اقتراف' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِہٖ ۚ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۝ ۱۱۴-۱۱۷

اصل حکم اللہ اور اس کی کتاب ہے

'افغیر اللہ ابتغی حکمًا وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلاً' یہ مشرکین کے مجادلہ کا پیغمبرؐ کی طرف سے جواب ہے کہ تم مجھ سے شرک و توحید اور حلال و حرام کے بارے میں جھگڑ رہے ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس جھگڑے میں کہ خدا کی خدائی میں کچھ اور بھی شریک ہیں یا وہی تنہا حکمران ہے، اس نے کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جائز رکھی ہیں، آخر حکم بننے کا حق کس کو حاصل ہے؟ خدا ہی کو یا کسی اور کو؟ اگر خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے اور لاریب اسی کو حاصل ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں جب کہ اس نے اس جھگڑے کے چکانے کے لیے ایک کتاب بھی تمہاری طرف اتاری ہے جس میں تفصیل کے ساتھ اس نے ہر چیز کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اب ایک طرف یہ مفصل خدائی کتاب ہے، دوسری طرف تمہاری بے سند بدعات ہیں، ان میں سے کس کی بات ماننے جانے کے لائق ہے۔؟

صالحین اہل کتاب کی گواہی

'والذین اٰتینٰھم الکتاب یعلمون انہ منزل من ربک بالحق فلا تکونن من الممترین' اس سے میرے نزدیک مراد، جیسا کہ بقرہ ۱۴۶ اور انعام ۲۰ کے تحت واضح کر چکا ہوں، صالحین اہل کتاب ہیں اور یہ بات بطور ایک شہادت حق کے نقل ہوئی

ہے کہ یہ جہلا اگر اس کتاب کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ جو سچے اہل علم اور حق پسند حامل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے اتری ہے اور یہ حق کے ساتھ اتری ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ 'فلا تکونن من الممترین' میں خطاب باعتبار الفاظ اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں روئے سخن دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ صالحین اہل کتاب کی اس شہادت کا ذکر سورہ قصص میں بھی ہے۔ الذین اٰتینٰھم الکتاب من قبلہ ھم بہ یومنون واذا یتلیٰ علیھم قالوا اٰمنا بہ انہ الحق من ربنا انا کنا من قبلہ مسلمین ۵۲۔۵۳ (اور جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم پہلے سے مسلم ہیں) یہ نکتہ یہاں ملحوظ رہے کہ جب کوئی حقیقت اول اول بگڑی ہوئی خلق کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ سب لوگ احسنت و مرحبا کہتے ہوئے اس کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ اس کے برعکس اکثریت اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے لیڈر اور قوم کے اشراف تو اس لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آتا ہے، رہے عوام تو وہ اپنے رسوم و رواج اور اپنے طریقۂ آبا کے بندے ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر وہ بات ان کو بری لگتی ہے جو ان کی مالوفات کے خلاف ہو اگرچہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو اور اپنی تائید و تصدیق میں اپنی پشت پر کتنی ہی واضح حجتیں رکھتی ہو۔ اکثریت کا یہ رویہ بسا اوقات ان لوگوں کو بھی اس حقیقت سے متعلق تذبذب میں ڈال دیتا ہے جو اگرچہ نیک نیت ہوتے ہیں لیکن ابھی ان کی فکر و نظر اتنی پختہ نہیں ہوئی ہوتی ہے کہ مخالفت کی آندھیوں اور اکثریت کے طوفانوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگوں کی رہنمائی اور دلدہی کے لیے اس آیت میں اشارۃً اور آگے والی آیت میں تصریحاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ کسی صداقت کی صداقت خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچی جا سکتی ہے اور اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ کافی ہے کہ سنجیدہ، ذی علم اور صاحب کردار لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے بعض ناصحوں نے اس سے کہا کہ 'تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سارا ایتھنز تمہارے خیالات سے برہم ہے، تم کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے؟' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ 'مجھے صرف اس ایک انسان کی پروا ہے جو دانش مند ہو'۔ اکثریت و اقلیت کی یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔

ابلیس کی پیشین گوئی کا حوالہ

'وتمت کلمۃ ربک صدقا و عدلا، لا مبدل لکلماتہ و ھو السمیع العلیم' یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آج یہ تم تمام شیاطین جن و انس کو جو اپنی اور اپنی دعوت کی مخالفت میں متحد پا رہے ہو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک وہی صورت حال ہے جو شیطان اور آدم کے ماجرے میں بیان ہو چکی ہے۔ شیطان نے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی خدا نے اس کو مہلت دی۔ شیطان نے دھمکی دی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو شرک و بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑوں گا۔ خدا نے فرمایا کہ اگر تو ایسا کرے گا تو میں تجھ کو اور تیرے سارے پیرووں کو جہنم میں بھر دوں گا۔ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنے باب میں اس کی پیشین گوئی پوری کر دی ہے اور اللہ نے ایسے لوگوں کے باب میں شیطان کو اپنا جو فیصلہ سنایا تھا وہ پورا ہو گیا اور یہ فیصلہ سچائی اور عدل دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی وہ سچی بھی ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اس لئے کہ خدا نے ان پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ ہدایت الٰہی کی جگہ القائے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اسی انجام کے سزاوار ہیں جس کی خدا نے ان کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں، ان کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ نہ اس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اس میں کسی غلطی یا ناانصافی کا امکان ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بات مشرکین کے لیے بطور تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور تسلی ارشاد ہوئی ہے۔ 'لا مبدل لکلمات اللہ' پر اسی انعام کی آیت ۳۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

اکثریت کا غوغا اس کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے

'وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ' اوپر آیت ۱۱۵ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہ اس کی تصریح ہے اور خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے لیکن معناً خطاب عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو غوغائے عام دعوت توحید کی مخالفت اور مشرکانہ بدعات کی حمایت میں برپا ہے اس کی مطلق پروا نہ کرو۔ یہ کسی دلیل و سند اور کسی علم و حجت پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر ظن و گمان کی پیروی پر مبنی ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں۔ 'ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون'۔ یہ دعوے جو کیا جاتا ہے کہ یہ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں یہ خدا کا بتایا ہوا اور ابراہیمؑ کی وراثت ہے محض ان کا افترا ہے۔ اللہ اور ملت ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مغالطہ بھی کسی کو نہیں ہونا چاہیئے کہ اکثریت اس فتنہ کے ساتھ ہے۔ وہ اکثریت جو علم سے عاری ہو اور محض گمان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اس

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں
عقیدہ اور مذہب و مسلک کی آزادی

(زیر طبع کتاب 'اسلامی ریاست' کے ایک باب سے)

اسلامی ریاست میں چونکہ اسلام ہی تمام حقوق شہریت کی بنیاد ہے اس وجہ سے جہاں تک عقیدہ کی آزادی کا تعلق ہے اسلامی ریاست میں وہ خارج از بحث ہے۔ اور اس چیز کی وجہ سے ایک شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایک لادینی ریاست (SECULAR STATE) میں آدمی کو عقیدہ سے متعلق جو آزادی حاصل ہوتی ہے اسلامی ریاست میں لوگوں کو وہ آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن لادینی ریاستوں کی اس ظاہر فریب آزادی کی حقیقت اچھی طرح واضح نہیں ہو سکتی جب تک ایک لادینی ریاست اور ایک اسلامی ریاست کے فرق کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ نہ سمجھ لیا جائے۔

ایک اسلامی ریاست میں شہری اپنی شخصی اور پرائیویٹ زندگی کے دائرہ میں جس دین کے پیرو ہوتے ہیں اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے دائرہ میں بھی اسی دین کے پیرو ہوتے ہیں۔ ان دونوں دائروں کے اندر وہ الگ الگ دینوں اور الگ الگ شریعتوں کی پیروی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس لادینی جمہوری ریاستوں میں شہری اپنی پرائیویٹ زندگی کی حد تک تو آزاد ہوتے ہیں کہ وہ جس دین کی چاہیں پیروی کریں — چاہے رحمٰن کے دین کی یا شیطان کے دین کی — ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اجتماعی اور سیاسی دائرہ کے اندر انہیں اُس مستقل سیاسی دین کی پیروی کرنی پڑتی ہے جس پر ریاست قائم اور چل رہی ہوتی ہے اور ریاست کے اندر یہ کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ اس دین سیاسی سے ذرا سا بھی انحراف اختیار کر کے ریاست کے اندر اپنے شہری حقوق قائم رکھ سکے۔

لادینی جمہوریتوں نے اجتماعی و انفرادی دینوں میں یہ مصنوعی اور بھونڈے قسم کا فرق پیدا کرکے اپنے ہاں عقیدہ و مذہب کی آزادی کی نمائش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بڑی بلند آہنگی سے یہ دعوے کرتی ہیں کہ ان کے نظام میں کسی شخص کا ذاتی مسلک و مذہب اس کے حقوق شہریت پر کسی نوعیت سے مؤثر نہیں ہوتا، کوئی شخص خواہ کسی دین و مذہب کا پیرو ہو ریاست کے اندر وہ پورے حقوق شہریت حاصل کرسکتا ہے اور جب تک کہ وہ ریاست کے دستور کا وفادار ہے اس کے شہری حقوق بہرحال قائم رہتے ہیں۔ لیکن اوّل تو ان کی اس رواداری اور فیاضی کی داد صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو کسی ایسے مرنجاں مرنج اور منفی قسم کے دین کا پیرو ہو جو صرف انسان کی پرائیویٹ زندگی ہی پر قانع ہو، اس کی اجتماعی زندگی سے نہ صرف یہ کہ وہ کوئی تعرض نہ کرتا ہو بلکہ اس دائرہ کے اندر وہ ہر کفر و باطل کی غلامی و تابعداری پر مطمئن ہو سکتا ہو[1] ثانیاً اس ادعائے آزادی کی حقیقت دراصل ایک فریب اور مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ ہر شخص سے اس کو حقوقِ شہریت کے لیے ایک شرط لازم قرار دیتے ہیں تو کیا یہ چیز بجائے خود ایک "دین" نہیں ہے؟ ایک اسلامی ریاست اپنے ہر شہری سے خدا اور رسول کی وفاداری کا عہد لے کر اس کو شہری حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور ایک لادینی جمہوریہ خدا اور رسول کے بجائے ملک، قوم اور دستور کی وفاداری کے عہد کے بدلہ میں شہری حقوق بخشتی ہے۔ آخر ان دونوں صورتوں میں نفسِ حقیقت کے پہلو سے کیا فرق واقع ہوا؟ دونوں میں وفاداری کے محور الگ الگ ضرور ہیں۔ ایک میں وفاداری کے محور قوم، ریاست اور دستور ہیں دوسرے میں اللہ، رسول اور قرآن۔ لیکن یہ فرق تو ایک ظاہری فرق ہے۔ اصلی چیز تو ایک مشترک اور بالاتر وفاداری ہے جو اجتماعی نظام کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دے سکے اور یہ چیز دونوں قسم کے نظاموں کے اندر بالکل ایک ہی درجہ کی اہمیت کے ساتھ یکساں طور پر موجود ہے۔ پھر یہ دعوے کس قدر مہمل اور بے بنیاد ہے کہ لادینی ریاستیں کسی شخص کو شہری حقوق دینے کے لیے اس کے مذہب سے بحث نہیں کرتی ہیں۔ اگر کہا جا سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لادینی ریاستیں ہر شخص سے اس کے اصل دین کے سوا ایک اور ریاستی دین کا مطالبہ کرتی ہیں، اور اس ریاستی دین کی قبولیت پر ہی

---

[1] جہاں تک ہمارے مطالعہ مذہب کا تعلق ہے ہم پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں سے کسی نے بھی کسی ایسے مرنجاں مرنج اور کفر دوست دین کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اس کی مدعی ہے تو وہ اپنے پیغمبر پر بہتان باندھتی ہے۔

اپنے تمام حقوق و فرائض کی بنیاد رکھتی ہیں۔ لیکن یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے کہ ان کے ہاں "دین" کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

بہرحال اسلامی ریاست جو ایک اصولی ریاست ہے اور اسلام کے اصولوں ہی پر قائم ہے کسی ایسے شخص کے لیے حقوقِ شہریت تسلیم نہیں کرتی جو اسلام کے اصولوں کا منکر یا ان سے باغی ہو۔ ان منکرین کے لئے جو اس کی اطاعت پر راضی ہوں اور وفاداری کے ساتھ اس کے نظام کی اطاعت کرنے کا عہد کریں اُس نے حقوق معیّن کر دیئے ہیں[1] اور باغیوں کے لیے اس نے سزائیں مقرر کر دی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

لیکن یہ بحث غالباً تشنہ رہ جائے گی اگر ہم یہاں بالاختصار اس امر کو واضح نہ کر دیں کہ اسلام کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اسلامی نظام کے اندر مسلک و مذہب اور فکر و رائے کی آزادی کے لیے ہر شہری کو ایک بڑا وسیع میدان ملتا ہے جس کے اندر ریاست یا تو سرے سے مداخلت کرتی ہی نہیں یا مداخلت کرتی ہے تو وہ مداخلت صرف تعلیمی اور تبلیغی نوعیت کی ہوتی ہے، قانون اور طاقت کی مداخلت نہیں ہوتی۔ چونکہ اس سلسلہ میں مختلف گروہوں کے اندر بعض شدید قسم کی غلط فہمیاں موجود ہیں اس وجہ سے اس مسئلہ پر ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ دفعہ وار گفتگو کریں گے۔

۱۔ اسلامی ریاست ایمان کی تمام جزئیات اور عقائد و اعمال کی تمام تفصیلات سے بحث نہیں کرتی، بلکہ جیسا کہ شہریت کے شرائط پر گفتگو کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں، اس کا تعلق صرف اسلام، یعنی ان ظاہری اعمال و عقائد تک محدود ہوتا ہے جو اجتماعی و سیاسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید و رسالت کا اقرار کرنا، مسلمانوں کے طریقہ پر نماز پڑھنا، اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرتے رہنا، نکاح و طلاق اور اکل و شرب میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ حرام و حلال کی پابندی کرنا، بس ریاست کا براہِ راست تعلق اسی طرح کے امور سے ہے اگر کوئی شخص ان چیزوں میں اسلامی طریقوں کا پابند ہے تو ریاست اس کو اس بنیاد پر شہریت کے حقوق سے محروم نہیں کرے گی کہ وہ فقہی مسائل میں امام مالکؒ یا امام احمدؒ کا پیرو کیوں ہے، امام ابوحنیفہؒ کا پیرو کیوں نہیں ہے؟ یا عقائد میں معتزلہ کا ہمنوا کیوں ہے، اشعری یا ماتریدی کیوں نہیں ہے؟ خانقاہی رجحانات کیوں رکھتا ہے نہایت کٹر قسم کا ظاہری یا

---

[1] دیکھو اس کتاب کا باب "غیر مسلموں کے حقوق"۔

اہل حدیث کیوں نہیں ہے؟ ان امور سے نہ براہ راست ریاست کا تعلق ہے اور نہ ان چیزوں کے اوپر حقوق شہریت کا انحصار ہے۔ ان فکری و نظری گوشوں کے اندر لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے اور اگر حکومت کسی غلط رجحان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کے لئے خاص تعلیمی و تبلیغی ذرائع استعمال کرتی ہے۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون اور طاقت کے ذریعے سے ان چیزوں کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے حدود سے تجاوز کرنے کی مجرم قرار پائے گی[۱]۔ اوپر کے مباحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص کو ادائے زکوٰۃ تک کے بارے میں شبہ تھا کہ یہ اسلامی ریاست کے اندر حق شہریت حاصل کرنے کے لئے یہ کوئی ضروری شرط ہے یا نہیں؟ وہ جان و مال کی حفاظت کی ضمانت حاصل ہو جانے کے لئے صرف اقرار کلمہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے دلائل کے زور سے ان کو قائل کیا کہ ادائے زکوٰۃ کے بغیر کسی شخص کو اسلامی ریاست کی حفاظت نہیں حاصل ہو سکتی تب جا کر وہ قائل ہوئے اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف ان کے جنگی اقدام کی تائید کی۔ ورنہ شروع شروع میں ان کی رائے یہی تھی کہ ان کے جان و مال مباح کر دینے کے بجائے ان کے حقوق کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

۲۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی بنیاد لازماً کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو گی جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ پوری فقہ اسلامی، بلا کسی استثناء و امتیاز کے، اس کا سرمایہ ہو گی اور تمام اجتہادی امور میں وہ بلا کسی تخصیص و ترجیح کے مختلف ائمہ کے اجتہادات پر نظر ڈال کر اپنے قانون کے لیے ان اقوال و مذاہب کو انتخاب کرے گی جو اس کی نگاہ میں کتاب و سنت اور روحِ اسلام

---

[۱] خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی حکومتوں نے اس بنیادی آزادی کو بسا اوقات سلب کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کی وجہ سے بے شمار مسلمانوں کے جان و مال مظالم کا شکار ہوئے، بہت سے ائمہ کرام کو نشانۂ جفا بنایا گیا اور حکومتوں کے مراکز اور بادشاہوں کے دربار، مختلف فرقوں کی سازشوں کے مراکز بن گئے۔ اب اگر خلافت راشدہ کے نمونے کی حکومت کا احیاء کیا جائے تو اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ اسلامی حکومت کلام اور فقہ کے مختلف مسلک لوگوں کے ذہنوں پر بالجبر ٹھونسنے کی حقدار نہیں ہے۔

سے قریب تر نظر آئیں گے۔ اس انتخاب میں برابر تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ آج سابق ائمہ میں سے کسی کے قول کو قانون کی حیثیت دے دی گئی ہو۔ لیکن کل دلائل کی قوت واضح ہونے کے بعد کسی اور کے قول کو اختیار کر لیا جائے۔ اس طرح ہر گروہ کا مسلک و مذہب یکساں طور پر حکومت کی نگاہوں میں محترم ہوگا اور ہر گروہ کے لوگوں کو اس کا پورا موقع حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مسلک و مذہب کے دلائل اور اس کی خوبیاں برابر پیش کرتے رہیں تاکہ ہمارے ائمہ کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کے اندر جس قدر جواہر ہیں سب نکھر کر سامنے آجائیں اور قانون کی تدوین کرنے والوں کو ان کے انتخاب میں آسانی ہو۔

ملک کا قانون تو بلاشبہ وہی ہوگا جو حکومت اپنے عمل کے لیے اختیار کرے گی اور جس کے مطابق اس کی عدالتیں فیصلے کریں گی اس کی اطاعت بہرحال ہر ایک کو کرنی پڑے گی۔ لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ حکومت کے اختیار کردہ مسلک و مذہب کے سوا کسی اور مسلک و مذہب کو شخصی رائے کی حیثیت سے بھی کوئی شخص اختیار نہ کر سکے گا یا اس کی تائید میں قلم اور زبان کی قوت استعمال نہ کر سکے گا۔ اگر کوئی شخص حکومت کے اختیار کردہ مسلک و مذہب کے مقابلہ میں کسی اور مسلک کو زیادہ قوی اور مدلل سمجھتا ہے تو ایک رائے کی حیثیت سے اسے اس کو پیش کرنے اور اس کی تائید و حمایت کرنے کی پوری آزادی حاصل رہے گی۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں آئے دن ایسے مسائل پیش آتے رہتے تھے جن کے بارہ میں امیر اور شوریٰ کے فیصلوں سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ اطاعت امیر کے فیصلوں ہی کی کرتے تھے لیکن رائے کی حد تک بدستور اپنے مسلک پر قائم رہتے تھے اور پوری آزادی کے ساتھ علانیہ اس کی تائید و حمایت[1] کرتے تھے۔

یہ اسی پابندیٔ نظم اور آزادیٔ رائے کی برکت ہے کہ ملک کا نظام بھی پورے استحکام کے ساتھ قائم رہا اور فکر و اجتہاد کے لئے وہ سارا مواد بھی اسی زمانہ میں فراہم ہوگیا جس سے بعد میں اسلامی فقہ کی مختلف عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ لوگوں کی فکری آزادی پر کوئی پابندی عائد کرنا اور اس کو دبانا تو الگ رہا، ایک صحیح اسلامی حکومت کی تو عین مصلحت اور خواہش یہ ہوگی کہ لوگ فکر و اجتہاد سے کام لیں اور تقلید کی

---

[1] اس کی ایک عمدہ مثال حضرت عثمان غنیؓ کا منیٰ میں نماز کے قصر نہ کرنے کا واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کے اس مسلک سے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کیا لیکن جب نماز کا وقت ہوا تو سب نے نماز انہی کے پیچھے اور انہی کے مسلک کے مطابق پڑھی اور یہ اختلاف بدستور باقی رہا اور اب تک باقی ہے۔

بندشوں سے آزاد ہوں۔ اور اگر کوئی گروہ اس کی اس خواہش کے خلاف تقلید کی بندشوں میں ہی جکڑے رہنا پسند کرے گا تو حکومت کے لیے اس کی اس پسند میں بھی خلل انداز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ حکومت سے بھی یہ مطالبہ کرے کہ وہ اسی کی طرح اپنے پاؤں میں بھی تقلید کی بیڑیاں پہن لے اور فکر و اجتہاد کی آزادی سے استعفیٰ دیدے۔ عامۃ الناس کا کوئی گروہ تو تقلید کی بندشوں میں بندھا ہوا رہ کر بھی کچھ دنوں اپنی زندگی کے دن پورے کر سکتا ہے لیکن کوئی حکومت تقلید کی جکڑبند کے اندر دو دن بھی اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس وجہ سے ایک اسلامی ریاست کے زیر سایہ اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ معاشرہ کے اندر فکری جمود پیدا ہوگا اور لوگ ایک ہی متعین ڈگر پر جانوروں کی طرح چلنے پر مجبور ہوں گے۔ جو لوگ غلط نمونوں کی بنا پر اسلامی حکومت کے متعلق اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں وہ لوگ اسلامی حکومت کی حقیقی آئیڈیالوجی اور اس کی صحیح مثال سے ناواقف ہیں۔

۳۔ ایک اسلامی حکومت ان اختلافات کو بھی ایک وسیع حد تک انگیز کرتی ہے جو سیاسی نقطہ نظر کے اختلاف، تاویل کی غلطی اور فلسفیانہ طرز کے تعمق سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں متعدد مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ ان تمام سیاسی اختلافات کو گوارا کیا گیا جو ظلم و تشدد اور بدامنی پیدا کرنے کی کوششوں (VIOLENCE) سے پاک رہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اسلامی اصولوں کی تاویل میں بعض گروہوں نے جو خطرناک غلطیاں کیں ان کو بھی اس وقت تک گوارا کیا گیا جب تک ان کی آڑ میں فتنہ و فساد کے شیطان نے انڈے بچے نہیں دے دیئے۔ اور قتل و خونریزی کے ذریعہ سے لوگوں کو دہشت زدہ اور حکومت کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

سیاسی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا آغاز ہی انصار و مہاجرین کی دو بڑی پارٹیوں کے امتزاج و ترکیب سے ہوتا ہے۔ انصار کا مطالبہ یہ تھا کہ خلافت کا منصب باری باری انصار و مہاجرین دونوں میں منتقل ہوتا رہے۔ ایک مرتبہ ایک مہاجر خلیفہ ہو دوسری مرتبہ ایک انصاری۔ مہاجرین نے انصار کے اس مطالبہ سے اختلاف کیا جس سے ایک شدید قسم کی نزاع اٹھ کھڑی ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لیکن انصار و مہاجرین کے بڑے لیڈروں کی دور اندیشی نے بالآخر معاملہ کو سلجھا لیا اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی۔ صرف خزرج کے لیڈر سعد بن عبادہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر راضی نہیں ہوئے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے پورے زمانہ خلافت میں

نہ تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ کھلم کھلا پورے نظم اطاعت سے بالکل الگ رہے۔ ان کے متعلق ابن قتیبہ کی تصریح یہ ہے:-

فکان سعد لا یصلی صلوٰتہم	سعد نہ ان کی اقتداء میں نماز پڑھتے،
ولا یجمع بجمعتہم ولا یفیض	نہ ان کی امامت میں جمعہ ادا کرتے، اور نہ
بافاضتہم ۔ ولو یجد علیہم	ان کی امامت میں حج ادا کرتے بلکہ اگر ان
اعواناً لصال بہم و لو	کو کچھ مددگار مل جاتے تو وہ ارباب اقتدار
یبایعہ احد علی قتالہم	پر حملہ بول دیتے اور اگر کچھ لوگ ان سے ان
لقاتلہم ۔ فلم یزل	لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بیعت
کذالک حتی توفی ابوبکر	کر لیتے تو وہ ان لوگوں سے جنگ بھی
رحمہ اللّٰہ و ولی عمر	چھیڑ دیتے۔ وہ اپنے اس رویہ پر قائم
بن الخطاب فخرج الی الشام	رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے
فمات بہا ولم یبایع لاحد	وفات پائی اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے
رحمہ اللہ ؎	حضرت عمرؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد وہ شام
	چلے گئے اور وہیں وفات پائی، لیکن بیعت
	دونوں صاحبوں میں سے کسی کے ہاتھ پر
	بھی نہیں کی۔ اللہ ان پر رحم کرے۔

اگر ابن قتیبہ کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو اسلامی قانون کی رو سے سعد بن عبادہ کا یہ طرزِ عمل بالکل غلط تھا اور حکومت کی طرف سے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سیاسی رواداری کا یہ کمال دیکھیے کہ وہ پورے طنطنہ کے ساتھ اپنی ضد پر اڑے رہ جاتے ہیں اور کوئی معمولی سے معمولی سزا بھی ان کو نہیں دی جاتی۔ حضرت ابوبکرؓ کی درگزر کو ایک شخص ان کی نرمی پر محمول کر سکتا ہے لیکن فاروق اعظم بھلا کسی کو اتنی ڈھیل — اور وہ بھی ڈسپلن کے معاملہ میں — کب دینے والے تھے! تاہم آپ نے دیکھا کہ انہوں نے بھی سعد سے کوئی تعرض کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت حکومت اتنی کمزور تھی کہ انصار کے کسی لیڈر کے خلاف

؎ الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ صفحہ ۱۱۔

کوئی کارروائی کرنا مصلحت کے خلاف ہوتا۔ حکومت اپنے ابتدائی دور کی مشکلات میں مبتلا ضرور تھی مگر حضرت ابوبکرؓ جو اس ابتدائی دور کی مشکلات کے اندر مانعین زکوٰۃ سے جنگ چھیڑ دینے میں ذرا بھی نہ جھجکے، مٹھی بھر خزرج سے کب دبنے والے تھے؟ پھر اگر ان کی نسبت یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انہوں نے مصالح کا لحاظ کیا تو حضرت عمرؓ کے سامنے کیا مصلحت ہو سکتی تھی جن کے دبدبے نے عرب و عجم سب پر لرزہ طاری کر دیا تھا؟ اصل یہ ہے کہ سعد کا یہ رویہ اس لئے گوارا کر لیا گیا کہ انہوں نے اس عدم بیعت کے ساتھ کوئی عملی کارروائی قائم شدہ نظام کو الٹنے کے لئے نہیں کی اور نہ وہ کر سکتے تھے۔ انصارؓ نے ایک ایک بچے نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پہ بیعت کر لی تھی اور سعد کے ساتھ ان کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسی حالت میں ایک وہمی اور خود اعتمادی سے محروم حکومت تو سعد کے خلاف کوئی منتقمانہ کارروائی کر کے اپنے دل کا غصہ نکال سکتی تھی لیکن صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی شان سے یہ بات بعید تھی کہ وہ ایک سایہ سے لڑنے کے لیے قانون کی طاقت استعمال کریں۔

انصار اور مہاجرین کی ان دو بڑی پارٹیوں کے علاوہ خود مہاجرین کے اندر تین نمایاں پارٹیاں موجود تھیں۔ بنو امیہ کی پارٹی عثمان غنیؓ کی قیادت میں، بنو زہرہ کی پارٹی سعد اور عبد الرحمٰن بن عوفؓ کی سرکردگی میں، بنو ہاشم کی پارٹی حضرت علیؓ اور عباس بن عبد المطلبؓ کی رہنمائی میں اور ان میں سے بعض کا اختلاف حکومت کے ساتھ نہایت کھلا ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت نے انتہائی رواداری کے ساتھ اس اختلاف کو انگیز کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر کئی مہینے تک بیعت نہیں کی لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی محض اس وجہ سے ضروری نہیں خیال کی کہ ان کو علی مرتضیٰؓ جیسے ذمہ دار لیڈر سے یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس اختلاف رائے کو کسی فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے مخالفین اور نکتہ چینوں کو جس حد تک انگیز کیا اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص کو علم ہے کہ انہوں نے نہایت مظلومیت کے ساتھ قتل ہو جانا گوارا کر لیا لیکن اپنے مخالفین کو قوت کے زور سے دبانا گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو یہ کر سکتے تھے اور یہ کرنے کا ان کو پورا حق بھی حاصل ہو چکا تھا۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج کے فتنہ نے سر اٹھایا۔ آٹھ دس ہزار آدمیوں کی ایک جماعت ان کے لشکر سے اس بنیاد پر کٹ کر علیحدہ ہو گئی کہ انہوں نے خلافت کے قضیہ میں ابو موسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ کی پنچایت کو کیوں منظور کیا۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ ان الحکم الا للّٰہ، اللہ کے سوا کسی کو

فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے تھے کہ اللہ اور قرآن کا فیصلہ براہِ راست نافذ ہونا چاہیئے، اس کے لیے کسی واسطہ کو اختیار کرنا شرک و کفر ہے۔ پھر آگے بڑھ کر وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ چونکہ علی اور معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں نے پنچایت کو منظور کر کے (نعوذ باللہ) شرک و کفر کا ارتکاب کیا ہے اس وجہ سے وہ دونوں اور ان کے تمام ساتھی کافر ہیں۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس پر ایک رَدّہ انہوں نے اور جمایا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے اور اس کے لئے دائمی عذاب جہنّم ہے اور چونکہ علیؓ اور معاویہؓ نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اس وجہ سے ان کے لیے دائمی ......

تاویل کی غلطی اور پھر متکلمانہ طرز کے غلو اور تعمّق نے بات اس قدر بڑھادی کہ ایک طرف تمام صحابہ و تابعین اور مومنین وصالحین پر کفر اور خلود فی النار کا فتوٰے جڑ دیا گیا اور دوسری طرف ان الحکم الا للہ کی آڑ لے کر سرے سے کسی سیاسی ادارہ (POLITICAL INSTITUTION) کے جواز ہی سے انکار کر دیا گیا جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ نہ صرف ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ کی پنچایت ناجائز اور حرام ہے بلکہ لازمی طور پر خلافت کا پورا نظام بھی سراسر کفر و معصیت ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کے لحاظ سے خوارج ٹھیک ٹھیک "نراج" (ANARCHISM.) کے علمبردار تھے۔ اور عقائد کے باب میں انہوں نے جو بدعت کی اس میں تو وہ آج تک منفرد ہی رہے۔ لیکن خوارج کے اس سیاسی اور مذہبی عقیدہ کے باوجود معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ پہلے انہوںؓ نے ان کو افہام و تفہیم کے ذریعے سے قائل کرنے کی کوشش کی جس سے ایک حد تک فائدہ ہوا اور ان کی ایک اچھّی خاصی جماعت راہ راست پر آ گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی ایک جماعت اپنی ضلالت پر بدستور جمی رہی۔ جب وہ کسی طرح قائل ہوتی نظر نہیں آئی تو حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھجوایا کہ جب تک تم اپنے اس عقیدہ کی آڑ لے کر بدامنی اور خونریزی برپا کرنے کی کوشش نہیں کرو گے اس وقت تک ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے۔ لیکن اگر تم نے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کی تو ہم تم کو خلاف قانون قرار دے کر تمہاری سرکوبی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ نیل الاوطار میں ہے:

فارسل الیھم کونوا حیث	حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھجوایا کہ تم کو آزادی
شئتم ـ وبیننا وبینکم الا	حاصل ہے کہ جہاں چاہو رہو البتہ ہمارے اور
تسفکوا دمًا ولا تقطعوا سبیلاً	تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور
ولا تظلموا احدًا فان فعلتم	پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بدامنی نہیں پیدا
نبذت الیکم الحرب[1]	کرو گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے اگر ان باتوں

[1] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۹۔

میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں
تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔

دوسری جگہ حضرت علیؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں :-

لا نبدؤکم بقتال مالم تحدثوا فساداً [1]	اگر تم نے کوئی بد امنی برپا نہیں کی تو ہم تم سے لڑنے میں پہل نہیں کریں گے۔

حضرت علیؓ نے اس وعدہ کو پوری دیانت داری کے ساتھ نبھایا اور ان کے مفسدانہ خیالات اور انقلابی نظریات کے باوجود ان کی شہری آزادی اور ان کے شہری حقوق میں اس وقت تک کوئی مداخلت نہیں کی جب تک انہوں نے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ جب انہوں نے جتھہ بندی کرکے حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہا تو مجبوراً ان کی سرکوبی کے لیے حضرت علیؓ کو اقدام کرنا پڑا۔ ان کی جتھہ بندی اور فساد انگیزی کا ذکر روایتوں میں اس طرح آیا ہے :-

فخرجوا شیئاً بعد شئ الی ان اجتمعوا بالمدائن۔ فراسلھم علیؓ فی الرجوع، فاصرّوا علی الامتناع حتّٰی یشھد علٰی نفسه بالکفر لرضاہ بالتحکیم ویتوب۔ ثمّ راسلھم ایضاً۔ فقتلوا من اجتاز بھم من المسلمین۔ و مرّ بھم عبد اللہ بن خبّاب والیًا لعلیٍّ علٰی بعض تلک البلاد و معه سرّیته وھی حامل فقتلوہ و بقروا بطن سرّیته عن ولد فبلغ علیًّا فخرج الیھم فی الجیش [2]	اور یہ لوگ ہر طرف سے نکل نکل کر مدائن میں اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ حضرت علیؓ نے مراسلت کرکے ان کو ان کے عقیدہ سے باز آنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک علیؓ تحکیم پر راضی ہونے کے سبب سے اپنے کفر کا اقرار اور اس سے توبہ نہ کریں گے اس وقت تک ہم اپنے نقطۂ نظر پر جمے رہیں گے۔ حضرت علیؓ نے پھر مراسلت کی لیکن وہ بھی لاحاصل رہی (پھر انہوں نے کھلم کھلا زیادتیاں شروع کر دیں) چنانچہ جن مسلمانوں کا ادھر گزر ہو جاتا ان کو قتل کر دیتے یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے عبد اللہ بن خبّاب کو کسی علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجا، ان لوگوں نے ان کو پا لیا اور قتل کر ڈالا۔ ان کے ساتھ ان کی

[1] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۳ ۔ [2] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۲

لونڈی تھی جو حاملہ تھی۔ اس کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا۔ حضرت علیؓ کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجبوراً ان پر فوج کشی کی۔

خوارج کی اس ضلالت اور ان کے باغیانہ اور تراجی (ANARCHICAL) نظریات کے باوجود حضرت علیؓ کی حکومت نے ان کے ساتھ جو طرز عمل روا رکھا اس نے ہمارے فقہاء اور ائمہ کے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا کہ اگر کوئی گروہ ایسا ہو جو نظریہ و عقیدہ کی حد تک اس بات کا قائل ہو کہ سٹیٹ کیخلاف بغاوت کرنا جائز ہے لیکن عملاً نہ اس نے کوئی جنگ شروع کی ہو اور نہ اس کے لئے کوئی تیاری ہی کر رہا ہو تو اسلامی ریاست اس کو شہری حقوق سے محروم کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ چند احادیث نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیتے ہیں اور ملاحظہ فرمایئے کہ کس قدر عمدہ جواب دیتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے کتنا نفیس اور نازک استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

و فی احادیث الباب دلیل علی مشروعیۃ الکف عن قتل من یعتقد الخروج علی الامام ما لم ینصب لذلک حربا و یستعد لها لقوله صلی اللہ علیہ وسلم "فاذا خرجوا فاقتلوهم"۔[1]

اور اس باب میں جو حدیثیں نقل ہوئی ہیں ان کے اندر اس بات کی دلیل موجود ہے کہ شریعت ان لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو امام کے خلاف بغاوت کا عقیدہ رکھتے ہیں جب تک وہ اپنے اس عقیدہ کو عملی شکل دینے کے لئے کوئی جنگ نہ برپا کریں یا اس کے لیے کوئی تیاری نہ شروع کریں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "فاذا خرجوا فاقتلوهم"۔ جب وہ بغاوت کریں تب ان کو قتل کر دو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

وان قوما سوا اظهروا رای الخوارج لم یحل قتلهم بذلک و انما یحل اذا کثروا وامتنعوا

اگر کوئی قوم اسی طرح کی (باغیانہ) رائے کا اظہار کرے جس طرح کی رائے خوارج رکھتے تھے تو اس کی بنیاد پر ان کا قتل جائز نہیں ہوگا۔ ان کا قتل صرف

[1] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۴۰

بالسلاح واستعرضوا النّاس ؎۱

اس صورت میں جائز ہوگا جب ان کی تعداد زیادہ ہو جائے، وہ مسلح ہونے لگ جائیں اور لوگوں کے جان و مال سے تعرض کرنا شروع کر دیں۔

امام خطابی اس بات پر علماء کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود، اپنے شہری حقوق کے لحاظ سے، مسلمانوں کے اندر شمار ہوں گے۔

وقال الخطابی اجمع علماء المسلمین علی ان الخوارج مع ضلالتہم فرقۃ من فرق المسلمین واجازوا مناکحتہم واکل ذبائحہم وانہم لایکفرون ماداموا متمسکین باصل الاسلام ؎۲

خطابی کا قول یہ ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کے علماء کا اجماع ہے کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار ہوں گے اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کی اور ان کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے اور یہ کہ جب تک وہ اسلام کے اصول پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

ابن بطال فرماتے ہیں کہ:

ذھب جمہور العلماء الی ان الخوارج غیر خارجین من جملۃ المسلمین ؎۳

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ خوارج مسلمانوں کے زمرہ سے خارج نہیں ہیں۔

یہ ساری مثالیں ہم نے خلافت راشدہ کی تاریخ سے پیش کی ہیں تاکہ ان کے بارے میں کسی کے لئے اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس پوری تفصیل کو جو شخص غور سے پڑھے گا وہ اس امر کا اچھی طرح اندازہ کر سکے گا کہ ایک اسلامی حکومت کی بنیاد اگرچہ اسلام پر ہوتی ہے لیکن اس کے اندر فکر و رائے اور مسلک و مذہب کی آزادی کے لیے بڑی وسعت ہوتی ہے۔ حقیقی اسلام جو خدا کے ہاں مقبول ہے اور جس کے قبول کرنے اور نہ کرنے پر نجات کا انحصار ہے وہ تو بلاشبہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے۔ اس میں کسی شخص کے لئے ذرّہ برابر بھی خود رائی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رائی کے دانہ کے برابر غیر اسلام کا کھوٹ اس میں ملائے گا تو وہ خدا کے ہاں مجرم قرار

بقیہ صفحہ ۸۰ پر

؎۱ نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۶ ؎۲ نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۴۱ ؎۳ نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۴۱

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

سائنسی علوم میں
ہماری موجودہ درسی کتابوں کے نقائص

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کی درسی کتابیں ناقص ہیں اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی نشو و نما کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ایسے مغربی مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جن کا نقطۂ نظر کافرانہ اور ملحدانہ ہے۔ علم و تعلیم کے متعلق کم از کم جہاں تک ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کا تعلق ہے درست نہیں۔ ہم نے ان کتابوں کو سوچے سمجھے بغیر مغرب کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے اور ہر بات میں ان کی فوقیت کے وہم میں مبتلا ہو کر اپنے ہاں نافذ کر رکھا ہے۔

مثلاً پہلے طبیعیاتی علوم کی درسی کتابوں کو لیجئے۔ ان علوم میں فزکس، کیمسٹری اور اسٹرانومی وغیرہ شامل ہیں اور ان سب کے لئے طبیعیات یا فزکس کا مختصر نام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان علوم کی درسی کتابوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کا مواد اس غلط مفروضہ یا عقیدہ پر مبنی ہے کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہم براہِ راست اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ جو چیز ہم اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کر سکتے، وہ یا تو موجود ہی نہیں یا پھر اگر موجود ہے تو اسے ہم جان نہیں سکتے اور لہٰذا وہ معدوم کے حکم میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مفروضہ میں خدا اور خودی اور ان کی صفات کا انکار شامل ہے۔ لیکن اس مفروضہ کے غلط ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ یہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ فی الواقع صحیح ہے اور سچائی پر مبنی ہے تو ہم اسے ایک صداقت قرار نہیں دے سکتے کیونکہ اس مفروضہ کو کسی شخص نے براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ ایک عقیدہ یا مفروضہ ہے لہٰذا یہ مفروضہ اپنی تردید خود کر دیتا ہے۔ مغرب کے علمائے طبیعیات اس مفروضہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ طبیعیات کو کسی ایسے عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیے جو سائنسی طریقوں سے یعنی براہِ راست حواسِ خمسہ کے مشاہدہ سے ثابت شدہ نہ ہو۔ لیکن ان کا یہ اصول خود ایک عقیدہ ہے جو سائنسی

کے دلائل سے ثابت شدہ نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا عقیدہ پہلے موجود ہوتا ہے اور ان کی سائنسی تحقیق بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی سائنسی تحقیق اس عقیدہ کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ان کا یہ عقیدہ ان کی سائنسی تحقیق کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طرح سے جب مغربی ماہر طبیعیات اپنی سائنسی تحقیق کو اس عقیدہ سے شروع کرتا ہے کہ سائنسی تحقیق کو کسی عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیئے تو وہ اپنی تردید خود کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے کہ جس عقیدہ سے وہ اپنی سائنس شروع کرتا ہے وہ غلط ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی سائنس دان اپنی سائنس کو ایک عقیدہ سے ہی شروع کرتا ہے لیکن آخر مغرب کے سائنسدان یہ کہنے کے باوجود کہ سائنس کو کسی عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیئے اس بات پر مجبور کیوں ہیں کہ اپنی سائنس کا آغاز ایک عقیدہ سے کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فقط محبت کا ایک جذبہ ہے اور محبت کسی مقصود یا مطلوب کے عمدہ یا حسین ہونے کے عقیدہ کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کا کوئی فعل ایسا بھی ہو جو کسی عقیدہ پر مبنی نہ ہو مثلاً ہر فعل سے پہلے اس کا فاعل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا یہ فعل فلاں مقصد کو حاصل کرے گا اور اس کو انجام دینے کا فلاں طریقہ عمدہ اور حسین ہے اور یہ عقیدہ اگرچہ معمولی سا نظر آتا ہے لیکن آخر کار حقیقت کائنات کے کسی تصور سے یا کسی نظریہ زندگی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیق بھی چونکہ ایک انسانی فعل ہے وہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور ممکن نہیں کہ وہ کسی عقیدہ سے آغاز نہ کرے۔

یہاں شاید یہ سوال کیا جائے گا کہ مغربی ماہر طبیعیات کا یہ مفروضہ کہ صداقت وہی ہے جس کا مشاہدہ ہم براہ راست حواس خمسہ سے کرتے ہیں۔ اگر سائنسی طریقوں سے ثابت شدہ نہیں تو پھر اس کی عقلی اور علمی بنیاد کیا ہے۔ اور اسے کس بنا پر سائنسی تحقیق کا راہ نما عقیدہ بنا دیا گیا ہے۔ حیرانی کی بات تو یہی ہے کہ اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور پھر بھی مغرب کے ماہرین طبیعیات نے اسے طبیعیات کی علمی اور عقلی جستجو کی راہ نمائی کرنے والے ایک عقیدہ کا مقام دے دیا ہے۔ یہ مفروضہ دراصل بعض لوگوں کی گٹھ جوڑ یا باہمی سمجھوتہ تھا۔ جو مذہب عیسائیت کی ضرورتوں اور مصلحت اور سیاست کے بعض تقاضوں کی بنا پر عمل میں لایا گیا تھا اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ سائنس اور سائنسدانوں کو کلیسا سے بچانے کے لئے بعض بہانوں سے خدا کے عقیدہ کو جو پہلے سائنس میں موجود تھا سائنس سے خارج کر دیا جائے۔ مغرب کے علمی حلقوں میں بھی اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے سائنس کا مخصوص طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی وہ اسپین کے مسلمان تھے اور یہ لوگ سائنس کے موجد اس لئے بنے تھے کہ ان کے لئے قرآن حکیم کا ارشاد تھا کہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ کر کے خدا کو پہچانو۔ چنانچہ انہوں نے خدا کی معرفت کی جستجو میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور ان سے جو نتائج حاصل کئے ان کو ضبط تحریر میں لائے۔ آج ہم اسی قسم کے نتائج کو سائنس کا نام دیتے ہیں۔ چونکہ دنیا کے ان پہلے سائنس دانوں کی سائنس خدا

کے عقیدہ سے پیدا ہوئی تھی لہٰذا خدا کا عقیدہ اس کا مدار و محور تھا۔ لیکن جب ہسپانوی مسلمانوں کے حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اسپین سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو پولوسیت (PAULISM) یا جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین پاک اور مقدس ہے اور دنیا ناپاک اور غیر مقدس۔ لہٰذا سائنس جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے دین سے الگ راستہ نکالتی ہے اور دین کو خراب کرتی ہے۔ لہٰذا اہل کلیسا نے سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا اور سائنسدانوں نے اپنا بچاؤ اسی میں سمجھا کہ سائنس سے خدا کا عقیدہ نکال کر اس کو ایک خالص دنیاوی اور پلید قسم کی کارروائی کا درجہ دے دیں تو پھر اس کے خلاف کلیسا کو شکایت کا موقع نہیں رہے گا۔

اسی اثنا میں کلیسا اور ریاست کے افتراق نے اسے ایک شدید سیاسی ضرورت بنا دیا۔ کیونکہ ممکن نہیں تھا کہ پوپ کے اثر و نفوذ کو سائنسی علوم اور مکتب کے چور دروازہ سے داخل ہو کر بادشاہ کے کام میں دخل انداز ہونے کی اجازت دی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی درسی کتابوں سے خدا کا عقیدہ خارج کر دیا گیا۔ سائنس کی بے خدائیت کو ایک علمی رواج اور فیشن کی شکل دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے سائنس دانوں اور فلسفیوں نے نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اپنے استدلال پر جبر کرنا شروع کر دیا اور قدرتی بے ساختہ اور معقول استدلال کے جس راستہ پر ان کو خدا کا تصور دور سے سامنے نظر آتا وہ اپنے استدلال کو بزور اس راستہ سے ہٹا کر ایک اور راستہ پر ڈال دیتے تاکہ خدا کا تصور راستہ میں آنے نہ پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انیسویں صدی کے نظریہ مادیت اور ڈارون کے نظریہ ارتقا ایسے سائنسی نظریات سائنس کی بے خدائیت کے رواج کے مطابق ڈھلنے لگے تو لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ یہ رواج ایک مذہبی عقیدہ پر اور ایک مصلحت اور سیاسی ضرورت پر مبنی ہے اور اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور غلطی سے یہ سمجھنے لگے کہ یہ سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے اور آج تک ایسا ہی سمجھا جاتا ہے اگرچہ انیسویں صدی کی مادیت اور ڈارون کے میکانکی نظریہ ارتقا کو بھی اب نئے حقائق نے روند ڈالا ہے۔ اگر حسی صداقت کا معروضہ منزلی سائنس دانوں کا کوئی علمی اصول ہوتا اور محض خدا کے عقیدہ کے خلاف ان کی گٹھ جوڑ کا نتیجہ نہ ہوتا تو وہ ہر غیر حسی صداقت کو مسترد کر دیتے۔ لیکن وہ اس اصول کو کام میں لا کر صرف خدا ہی کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ اور باقی ہر صداقت کو جو ثابت ہو سکے خواہ وہ براہ راست مشاہدہ میں آئے یا نہ آئے قبول کرتے ہیں اور اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ معروضہ غلط ہے۔ صداقت وہی نہیں جسے ہم براہ راست اپنے مشاہدہ سے معلوم کریں بلکہ وہ بھی ہے جسے ہم براہ راست مشاہدہ سے تو معلوم نہ کر سکیں لیکن اس کے اثرات اور نتائج کو براہ راست مشاہدہ سے معلوم کر سکیں۔ اس کی مثال ایٹم ہے۔ ایٹم کا جس قدر علم سائنس دانوں کو آج تک حاصل ہوا ہے وہ اس کے براہ راست مشاہدہ پر نہیں بلکہ اس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ پر اپنا دارومدار رکھتا ہے۔ خدا کا وجود

بھی ایک ایسی ہی حقیقت ہے جس کا علم ہم اس کے براہ راست مشاہدہ سے حاصل نہیں کرتے بلکہ مظاہر قدرت کی صورت میں اس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے سائنس دان ایٹم کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے ایٹم کو ایک سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں تو مظاہر قدرت میں خدا کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے خدا کو ایک سائنسی حقیقت کیوں نہیں سمجھتے اس کی وجہ سائنس کی بے خدائیت کا وہی پرانا نامعقول رواج، خدا کے تصور سے وہی پرانا ڈر اور اس کے خلاف وہی پرانا تعصب ہے جو کلیسا کی سائنس دشمنی سے پیدا ہوا تھا۔

جس چیز نے طبیعیات کے علم کو ممکن بنایا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعیاتی مظاہر قدرت میں ایک نظم یا (ORDER) پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نظم ایک ایٹم میں، ایک سالمہ میں ایک کرسٹل میں، برف کے ایک گالہ میں نظام شمسی میں بلکہ ہر مادی مظہر قدرت میں موجود ہے اور یہ نظم اس قدر جچا تُلا ہے کہ ہم اسے ہمیشہ ریاضیاتی اعداد و رموز میں بیان کر سکتے ہیں۔ اس گاڑی کی بڑھتی ہوئی رفتار بھی جو ایک اونچے مکان کی چھت سے نیچے گرائی گئی ہو اور لوہے کی اس سلاخ کی بڑھتی ہوئی طوالت بھی جسے گرم کیا جا رہا ہو ریاضیات کے ایسے اٹل قوانین سے مطابقت رکھتی ہے جو کائنات میں اس وقت بھی اپنا کام کر رہے تھے جب ہنوز دنیا میں کوئی ریاضیات جاننے والا بلکہ کوئی انسان اور کوئی متنفس بھی موجود نہ تھا۔ ان قوانین کو کس ذہن نے سوچا تھا؟ جدید طبیعیات کی تحقیق کے مطابق مادہ فنا ہو جاتا ہے اور اگر کائنات کو برقرار رہتے ہوئے آہستہ آہستہ کائنات سے نکال دیا جائے تو مادی مظاہر قدرت کے اندر جو چیز باقی رہ جائے گی وہ کچھ خیالی ڈھانچے اور کچھ ریاضیاتی نسبتیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لازوال اور اٹل ریاضیاتی نظم کو سوچنے والا ذہن ہی مادی مظاہر قدرت کی بنیادی حقیقت ہے۔ اگر ان میں یہ نظم موجود نہ ہوتا یا زمان و مکان کے لحاظ سے اور ہر وقت اور ہر جگہ مسلسل اور یکساں نہ ہوتا تو طبیعیات کی سائنس ممکن نہ ہوتی۔ ماہر طبیعیات کا کام یہی ہے کہ وہ ان مظاہر قدرت میں نظم دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب کسی مظہر قدرت میں یہ نظم دریافت کر لیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس کی سائنس ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے اور جب دریافت نہیں کر سکتا تو سمجھتا ہے کہ ابھی اس کی سائنس اس سمت میں ترقی نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قدرت میں نظم کی موجودگی کسی دارائے علم و حکمت اور اختیار و قدرت ذہن یا شخصیت کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہے۔ اگر مکئی کے کچھ دانے سڑک پر بکھرے ہوئے ہوں تو آپ کہہ سکیں گے کہ شاید وہ سڑک پر چلنے والے کسی چھکڑے سے اتفاقاً گر گئے ہیں۔ لیکن اگر وہی دانے ایک باقاعدہ ہشت پہلو ریاضیاتی شکل میں آراستہ ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ایسے ذہن کی تخلیق ہے جو ریاضیاتی انداز میں سوچ سکتا ہے اور حسن اور کمال کا ذوق رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی ایسے جنگل میں جا رہے ہوں جس کے متعلق یہ بات مشہور ہو کہ اس میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا اور آپ اچانک کسی خوبصورت جھونپڑی کے

پاس آنگن جھرکے صحن میں سبزہ اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ذہن یا شخصیت کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس جنگل میں کبھی کوئی انسان نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ نظم کے اندر مقصد بھی شامل ہے کیونکہ نظم کی تخلیق اور تکمیل خود ایک مقصد ہے اور مقصد ایک شخصیت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ طبیعیات کا محقق اپنے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت سے نظم کی جستجو کرکے اور اسے دریافت کرکے یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ کس کا ذہن ہے اور یہ کون سی شخصیت ہے جس کی تخلیقی کارروائی اور مقصدیت مادی کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں آشکار ہے۔ اس سوال کا عقلی اور علمی جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو تخلیق کی قدرت اور علم اور حکمت اور حسن اور کمال کی محبت کے اوصاف رکھتا ہے اور چونکہ اس کا پیدا کیا ہوا نظم ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی رہتا ہے وہ خالق کائنات ایک ہی ہے۔ یہ سوال چونکہ طبیعیات کی درسی کتاب پیدا کرتی ہے اس کا جواب بھی درسی کتاب ہی کو دینا چاہیئے اور کسی اور کتاب کو نہیں۔ لیکن مغرب کا ماہر طبیعیات اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتا ہے بلکہ اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ اور اس کی وجہ وہی سائنس کی بے دینیت کا نامعقول رواج ہے۔ لیکن ہمیں اس رواج کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم طبیعیاتی علوم کی درسی کتابوں کو نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ جہاں جہاں ہم نظم کے ثبوت پر پہنچیں وہاں اس نظم کو خالق کائنات کی تخلیقی کارروائی کی ایک شہادت کے طور پر بیان کریں اور اس کا ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیں تاکہ طالب علم کے دل میں خدا کی محبت کا جوہر پیدا ہو اور اپنے کمال کو پہنچے۔

اب حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کی طرف آیئے۔ ان علوم میں زوآلوجی اور باٹنی وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ ان علوم کی درسی کتابوں کا مواد بھی حسّی صداقت کے نامعقول مفروضہ سے دبا ہوا ہے حالانکہ حیاتیاتی مظاہر قدرت میں نظم اور مقصد کے اوصاف جو کسی خلّاق علیم کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہوتے ہیں۔ مادی مظاہر قدرت سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک سیل (CELL) یا خلیہ نظم اور مقصدیت کا حیرت انگیز شاہکار ہے اسی طرح سے ایک زندہ جسم حیوانی اور اس کا ہر عضو صرف آنکھ اور کان کی تخلیق میں علم حکمت اور قدرت کے جو کمالات بروئے کار آتے ہیں ان پر ایک بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایک زندہ جسم حیوانی کے اندرونی حیاتیاتی وظائف مثلاً عمل انہضام اور اس کی حیاتیاتی کیمیا، حیاتین اور دفاقین کی تیاری۔ دوران خون۔ سانس کی آمد و رفت۔ تناسل ایک خاص طے شدہ جسمانی شکل کی جانب حیوان کی خودکارانہ نشوونما اس کے اعضائے رئیسہ کا خودکارانہ عمل۔ زخموں کا خودبخود بھرنا اور بیماریوں کے خلاف صحت بحال کرنے والا خودبخود ظہور پذیر ہونے والا ردعمل ان میں سے ہر وظیفہ ثابت کرتا ہے کہ حیوان کی پیدائش اور نشوونما ایک ایسے

ذہن کے قادرانہ اور حکیمانہ تصرف میں ہے جو خود جیوان کا ذہن نہیں، لہٰذا حیاتیات کی درسی کتابوں کا مواد بھی یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ ذہن کس کا ہے اور اس سوال کا عقلی اور علمی جواب بھی یہی ہے کہ کسی قادر مطلق۔ خالق کائنات کا۔ لیکن یہاں مغرب کا درسی کتاب لکھنے والا پھر اس سوال کے جواب میں خاموش رہتا ہے۔ وہ یا تو حیاتیاتی مظاہر قدرت میں نظم اور مقصد کی موجودگی بالکل تسلیم ہی نہیں کرتا یا اگر تسلیم کرتا ہے تو اس طرح سے کہ کسی خالق کائنات کا تصور اس کی درسی کتاب میں راہ نہ پا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ارتقا کو جو خالق کائنات کی عالمگیر ربوبیت کا ایک شاندار اور یقین افروز مظہر ہے قدرت کی بے جان اور بے مقصد میکانکی قوتوں کی اندھا دھند کارروائی کا اتفاقی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اگر اس کی بات کو صحیح مانا جائے تو یہ بھی طالب علم کو ماننا پڑتا ہے کہ اگر قدرت کی یہی بے بصر قوتیں کسی اور طرح سے کام کرنے لگ جائیں تو ممکن ہے کہ آج جو انسان ہے وہ انسان نہ ہوتا بلکہ گندگی میں رینگنے والا کوئی کریہہ المنظر حیوان ہوتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کو خود نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ حیاتیاتی مظاہر قدرت کے اندر نظم اور مقصد کی تشریح کرتے ہوئے اُسے خدا کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ قرار دیں اور ایسا کرنے کے لئے ہر موقعہ سے جو درسی کتاب کے مضمون کے اندر پیدا ہو فائدہ اٹھائیں۔

نفسیاتی یا انسانی علوم میں مغرب سے مانگی ہوئی درسی کتابوں کے نقائص اور بھی زیادہ نمایاں اور افسوسناک ہیں۔ ان میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ اقتصادیات، فلسفہ قانون، فلسفہ تعلیم، فلسفہ ہنر، فلسفہ تاریخ، نفسیات فرد اور نفسیات جماعت وغیرہ۔ ان کو نفسیاتی علوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی اعمال کے علوم ہیں اور انسانی اعمال کی جڑ انسان کی فطرت یا اس کی نفسیات میں ہے۔

مغرب میں یہ علوم محض بے ربط اور پراگندہ خیالات کے مجموعے ہیں اور ان کی حالت اس قدر خراب ہے کہ بعض مغربی حکما ان کو علوم کے معزز نام سے یاد کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی حکما کو انسان کی فطرت کا ہی علم نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ انسانی افعال کا سرچشمہ اور اُن کا مقصد اور مدعا کیا ہے۔ ان علوم کی خراب حالت کے متعلق خود کچھ کہنے کی بجائے میں آپ کو مغرب کے ایک نامور ماہر نفسیات میکڈوگل کی کتاب "انتشارِ عالم" (WORLD CHAOS) سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

"فطرت انسانی کے بارہ میں ہماری لاعلمی اب تک تمام انسانی اور اجتماعی علوم کی ترقی کے لئے سدِ راہ بنتی رہی ہے اور اب بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک شدید ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ شاید مکمل تباہی کے شدید خطرہ کا سامنا کر رہی ہے۔ ہم علم نفسیات کا علم اقتصادیات کا علم سیاسیات کا علم قانون کا علم معاشرت کا اور اس

کے علاوہ اور بہت سے فرضی علوم کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دل کش نام فقط ہمارے علم کے خلاؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فقط ان کے وسیع و عریض بے آباد صحراؤں کی واضح نشان دہی کرتے ہیں جن کی سیاحت ابھی تک نہیں کی گئی۔ لیکن یہ صحرا وہ ہیں کہ اگر ہماری تہذیب نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ان کو کسی قاعدہ کے تحت لانا ہی پڑے گا۔ میرا دعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے توازن کو بحال کرنے کے لئے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کا علم (منظم کیا ہوا آراستہ کیا ہوا علم یا سائنسی علم) اس سے بہت زیادہ درکار ہے جو ہمیں اب تک حاصل ہوا ہے۔

لہٰذا یہ ہے وہ ایک ہی طریق کار جس سے ہم اپنی تہذیب کو موجودہ غیر یقینی اور دن بدن زیادہ خطرناک ہونے والی حالت کا مداوا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انسانی اور اجتماعی علوم کو پوری کوشش کے ساتھ ترقی دے کر فطرت انسانی اور اس کی تعلیقوں کے سچ مچ کے علوم کی شکل دینی چاہیئے۔ انسانی اور اجتماعی علوم کی بنیاد دریافت کرنے اور ان کے طریق ترتیب و تدوین کو بہم پہنچانے کی ضرورت آج اتنی شدید ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ تو پھر عملی نقطہ نظر سے علاج کیا نکلا۔ میں اپنے جواب کو مختصر طور پر پیش کرنے کے لئے یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ایک ڈکٹیٹر ہوتا تو کیا کرتا ..... میں ہر ممکن طریق سے اس بات کی کوشش کرتا کہ ہمارے بہترین دماغوں کو طبیعی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم میں تحقیق کے کام پر لگا دیا جائے۔

(ورلڈ کرائسس، صفحات ۹، ۵۹، ۱۱۲، ۱۱۵)

حکمائے مغرب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی فطری خواہشات میں سے ایک خواہش ایسی ہے جو اس کے تمام اعمال کی قوت محرکہ ہے جو اس کی دوسری تمام خواہشات پر اور تمام اعمال پر حکمران ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے تمام سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، علمی، فنی، قانونی، جنگی اعمال اس خواہش کے مظاہر ہیں اور جب تک ہم اس خواہش کو نہ جانیں ہم ان اعمال میں سے کسی عمل کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا کوئی فلسفہ لکھ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکمائے آج تک ان اعمال کے جو فلسفے لکھے ہیں وہ انسان کی اس خواہش کو جاننے کے بغیر لکھے ہیں جو اس کے اعمال کی قوت محرکہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ فلسفے خود اُن کو مطمئن نہ کر سکیں اور ان کے اپنے خیال کے مطابق بے ربط خیالات کے پلندے ہوں تو اس میں تعجب کی بات کوئی نہیں۔

مغرب کے حکما کی نگاہ ابھی تک اس حقیقت پر نہیں پڑی کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ نصب العین کی محبت ہے جو فقط خدا کے نصب العین سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف

صداقت کا مفروضہ ان کے آڑے آتا ہے اور وہ کسی ایسی صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ خدا کے تصور کو علم کے اندر لانے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ہمیں کون سی چیز مانع ہے کہ ہم ان انسانی اور اجتماعی علوم کی درسی کتابوں کو اس حقیقت کی روشنی میں نئے سرے سے لکھیں کہ خدا کی محبت انسان کے اعمال کی اصلی قوت محرکہ ہے اور جب ایک انسان خدا کو نہ جانتا یا نہ سمجھتا ہو تو وہ اپنے اس جذبہ محبت کی تشفی کسی غلط نصب العین کی محبت سے کرتا ہے اور اس کی طرف خدا کی صفات منسوب کرتا ہے تاکہ اپنی غلطی کو مکمل کرکے اپنے اس جذبہ کی مکمل تشفی کا اہتمام کرے۔

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیام پاکستان کے بعد اس نے کیا لائحہ عمل اختیار کیا؟
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

☆ جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف:

ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایم اے۔ ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیۃ طلبا پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

ضخامت ۲۳۶ صفحات، سائز بڑا، طباعت آفسٹ مجلد مع گرد پوش

قیمت چار روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور ۱

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

منشورِ اسلام

(۲)

نصب العین کی خواہش اور نوعِ انسانی کی ذہنی اور اخلاقی صحت

اگر نصب العین کی خواہش کسی رکاوٹ یا مایوسی سے دوچار ہو جائے تو انسان کی شخصیت دب جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے اور انسان پریشان اور غمگین ہو جاتا بلکہ بعض وقت شدید قسم کی ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر یہ خواہش مسلسل اور مکمل طور پر مطمئن ہو رہی ہو تو انسان کے لئے ترقی پذیر راحت اور مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ ایک انسان کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبت ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اس کی شخصیت بھی متحد اور جوان اور صحت مند اور توانا اور بلند اور بالا ہوتی ہے اور اسی قدر زیادہ اس کی زندگی کی مسرت اور راحت اور طمانیت بھی مکمل اور بھرپور ہوتی ہے۔

تاریخ کا مدّعا

لہٰذا جب سے انسان کو اپنے آپ کا شعور حاصل ہوا ہے انسان ایک ایسے نصب العین کی جستجو میں مصروف ہے جس کے سامنے وہ مستقل طور پر اور اپنے دل کی پوری رغبت کے ساتھ اپنی والہانہ محبت اور خدمت اور اعانت اور ستائش اور پرستش کے نذرانے پیش کر سکے یعنی ایک ایسا نصب العین جو حسن اور کمال کے بلند ترین اور دائمی اور ابدی اوصاف سے آراستہ ہو تاکہ اس کی محبت انحطاط اور زوال اور مایوسی کے حادثات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے۔

لیکن اتفاق اس قسم کے نصب العین کی جستجو اسے شدید مصائب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بھیانک حادثات

کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے اور اس سے بڑی بڑی قربانیوں کی یہاں تک کہ جان کی قربانی کی قیمت وصول کرتی ہے تاہم وہ اس جستجو کو ترک نہیں کرتا کیونکہ اس کی فطرت کا ایک زبردست اور بے پناہ تقاضا اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اسے ہر حالت میں جاری رکھے خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ نوع انسانی کی پوری تاریخ (اپنے سارے مرحلوں اور شعبوں سمیت خواہ وہ سیاسی ہیں یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا فنی یا اقتصادی یا فوجی) جس میں جا بجا خوفناک ملک گیر اور عالمگیر جنگوں اور ان گنت انسانوں کی اندوہ ناک صعوبتوں کے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں فقط ان واقعات کی ایک داستان ہے جو حضرت انسان کو اپنے محبوب نصب العین کی حد درجہ دشوار جستجو کے دوران شروع سے لے کر آج تک پیش آئے ہیں۔

نصب العین کی عمومی صفات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندر فی الواقع کون سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے اس سوال کا جواب نصب العین کے لئے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے کیونکہ یہ خواہش حسن کے لئے ہے وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔ یعنی

(۱) جو ہر اس نقص یا عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصور کر سکتے ہیں اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ اور حسین اور قابل ستائش اور لائق محبت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبت کا دشمن ہے لہذا جونہی انسان کو اپنے نصب العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے اس کی محبت کافور ہو جاتی ہے بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشت ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبت کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کر سکے جن کا وہ تصور کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اس کے اندر موجود ہیں۔

ایک نصب العین کے خصوصی اوصاف

انسان کے نصب العین کے ان عمومی اوصاف سے ہم بڑی آسانی سے اس کے نصب العین کے خصوصی اور

تفصیلی اوصاف کا استنباط کر سکتے ہیں مثلاً ہم ان عمومی اوصاف کی روشنی میں یہ جان سکتے ہیں کہ :-

(۱) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ اُس کے نصب العین کے حسن کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ اس حد سے آگے اُس کا نقص شروع ہو جاتا ہے اور لہٰذا اس کا ایک حصہ ناقص ہے۔ پھر اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا حسن عارضی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے گا تو وہ مجبور ہو گا کہ اُسے آج بھی حسن سے محروم سمجھے۔

(۲) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین کوئی ایسی چیز ہو جو زندگی کا وصف رکھتی ہو کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کو اپنا محبوب نہیں بنا سکتا جو بے جان اور مردہ ہو۔ انسان خود زندہ ہے لہٰذا وہ کسی مردہ چیز سے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے گھٹیا اور کمتر درجہ کی ہو محبت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ خدمت کر سکتا ہے اور نہ اعانت۔ انسان کسی مردہ چیز کی ستائش اس وقت کرتا ہے جب وہ اس کی طرف نادانی سے زندگی کا وصف منسوب کر رہا ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسے کسی زندہ وجود کا مظہر سمجھ رہا ہو۔ ورنہ مردہ چیز کی خدمت اور اعانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو مردہ چیز کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی خدمت یا اعانت کر رہا ہے اور دوسرے خدمت یا اعانت کرنے والا اس کی خدمت یا اعانت کا نہ کوئی مفہوم معین کر سکتا ہے اور نہ مقصد۔

(۳) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کی زندگی اس کے حسن کی طرح دائمی ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ وہ مستقبل میں کسی وقت مرکر نیست و نابود ہو جائے گا تو وہ یہ محسوس کرنے کے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ وہ اب بھی ناپائدار ہے اور اب بھی بالقوہ مردہ ہی ہے اور وہ چھوڑ جانے والا دوست ہے جو قابل اعتماد نہیں۔

(۴) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر زندگی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ کمال موجود ہوں جن کا احساس وہ ایک زندہ وجود کی حیثیت سے اپنی ذات میں کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ وہ سن سکے اور دیکھ سکے، سمجھ سکے، محسوس کر سکے، محبت کر سکے اور محبت کا جواب محبت سے دے سکے۔ انسان کی دنیا کے اندر اس کا کوئی مقصود یا مدعا ہو جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہو اور اس بات کی طاقت رکھتا ہو کہ اس مقصود یا مدعا کو حاصل کرنے کے لئے عمل کر سکے اور اس عمل میں کامیاب ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ضروری ہے کہ وہ بعض آرا اور افعال کو پسند کرتا ہو اور بعض کو ناپسند اور اس بات کی قوت رکھتا ہو کہ وہ جن آرا اور افعال کو پسند کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کر سکے اور جن کو ناپسند کرتا ہے ان کی مخالفت کر سکے اور ان کو تباہ کر سکے۔ اپنے چاہنے والوں اور مددگاروں کو انعام عطا کر سکے اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دے سکے۔ مختصر طور پر یہ کہ اُس کے اندر محبت اور علم محبت کے تمام اوصاف موجود ہوں اور وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے

اُن کا اظہار کر سکے۔ اگر انسان کے نصب العین کے اندر ان اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی موجود نہ ہو اور انسان کو اس کا علم ہو جائے تو اس کے لئے اپنے نصب العین سے محبت کرنا یا اُس کی خدمت اور اعانت کے لئے کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبت ہمیشہ محبوب کی خدمت کے لئے عمل کا تقاضا کرتی ہے اور یہی عمل اس کی علامت اور اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کو خوش کیا جائے اور اس کی محبت یا رضامندی یا پسندیدگی یا قرب کے احساس کی مسرت حاصل کی جائے۔ ایک نصب العین کو چاہنے کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتے کہ نصب العین کے حصول کے لئے کام کیا جائے یا جد وجہد کی جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچا جائے۔ لیکن اگر انسان کا نصب العین اس قسم کا ہو کہ وہ نہ کسی عمل کو پسند کرتا ہو اور نہ ناپسند نہ اس کے نزدیک کوئی چیز زشت ہو نہ زیبا نہ حق ہو نہ باطل اور نہ نیک ہو نہ بد۔ دوسرے لفظوں میں انسانی دنیا کے اندر اس کا کوئی مدعا نہ ہو اور کوئی ایسا مقصد نہ ہو جس میں اس کے چاہنے والے اس سے تعاون کر سکیں۔ تو ایسی حالت میں اس کے چاہنے والے کیونکر جان سکتے ہیں کہ اس کی محبت کا اظہار کرنے کے لئے اور اس کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے اُسے خوش کرنے کے لئے اور اس سے قریب ہونے کے لئے ان کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ انسان اپنے نصب العین کی محبت کا اظہار کرنے کے لئے کوئی کام کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کام کیا ہے۔ وہ ایسی محبت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو عمل کی صورت اختیار نہ کر سکے اور دل ہی دل میں رہے اور انسان کے عمل کو اوروں کے لئے چھوڑ دے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس کا نصب العین نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے نہ جان سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ نہ محبت اور عمل اور خدمت اور قربانی کی قدر دانی کر سکتا ہے اور نہ محبت کا جواب محبت سے دے سکتا ہے تو اس کے چاہنے والوں کے لئے اُن کے خادمانہ افعال اور اعمال کے اندر کوئی کشش باقی نہ رہے گی اور ان کو جاری رکھنے کے لئے کوئی داعیہ موجود نہ رہے گا۔ غور سے دیکھا جائے تو جس چیز کو ایک انسان نیکی سمجھتا ہے وہ انگریزی زبان کی مشہور ضرب المثل کے خلاف کبھی اپنا انعام آپ نہیں ہوتی بلکہ اس کا انعام یہ مسرت انگیز یقین ہوتا ہے کہ یہ اُس کے نصب العین کو جسے وہ ہمیشہ ایک شخص یا شخصیت تصور کرتا ہے پسند آتی ہے۔

(۵) ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صاحب قدرت و قوت ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ اس کا نصب العین اپنے دوستوں اور مددگاروں کو صلہ دینے یا ان پر نوازش کرنے کی قدرت نہیں رکھتا یا اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دینے سے معذور یا بے بس ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس سے محبت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت کرنا ایک بے فائدہ مشغلہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے مطابق لانے

کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوگا اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا رہا ہوگا تو جان اس وقت اس کے مخالفین نہایت آسانی کے ساتھ اور کسی سزا کے خوف سے بے پروا ہو کر اس کے سارے کام کو بگاڑ رہے ہوں گے اور اس کی ساری کوششوں کو خاک میں ملا رہے ہوں گے اس صورت میں وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبت اور پرستش کا حقدار نہیں۔

(۶) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر نیکی کے اوصاف بھی بدرجہ کمال موجود ہوں۔ کیونکہ یہ اوصاف بھی حسن کے اوصاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو سراہتے اور پسند کرتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ ان اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا ہے جو اس کے نصب العین میں موجود نہیں تو ضروری بات ہے کہ وہ اس کو ایک نقص قرار دے اور جس حد تک کہ اس کا نصب العین اس وصف سے عاری ہو اُسے حسن سے بھی عاری سمجھے اور اس سے محبت نہ کرسکے۔

(۷) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین اپنے اوصاف میں بے نظیر اور بے مثال ہو اور کوئی ہمسر یا شریک نہ رکھتا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ سمجھے کہ کوئی اور تصور بھی اس کے اوصاف میں شریک ہے تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت کرے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی فطرت کی رو سے ناممکن ہے۔ کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے اور لہٰذا کوئی انسان بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت نہیں کر سکتا اور پھر حسن کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ بھی بیک وقت دو نصب العینوں میں اپنی حالت کمال پر موجود نہیں ہو سکتا۔

(۸) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین ایسا ہو کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے مدعا کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں ضروری ہے کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کائنات کے جو قوانین مادی، حیاتاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں چونکہ اس کے اپنے پیدا کئے ہوئے نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے یا پوری طرح سے ہم آہنگ نہ ہوں گے لہٰذا وہ اور اس کا نصب العین دونوں اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ اپنے اس مدعا کو حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ سمجھے گا کہ کائنات جس میں وہ بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور خود بخود قائم ہے اور اس پر اور اس کی اپنی ذات پر اس کے نصب العین کا کوئی اختیار یا تصرف نہیں تو وہ سمجھے گا کہ اس کے نصب العین کی حیثیت اگر اس کی اپنی ذات سے کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں اور لہٰذا وہ اس بات کی ضرورت محسوس نہ کرے گا کہ وہ اس سے محبت کرے اس کی ستائش کرے یا اس کی خدمت کے لئے جانفشانیاں کرے۔

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں ۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے ۔ لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو۔ ایک پتھر ہو یا ایک درخت ہو یا دریا ہو یا پہاڑ یا ایک بُت ہو۔ یا قوم یا نسل یا وطن یا ایک نظریہ یا ازم وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسوب کرتا ہے ۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصور اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیت ہے جس میں زندگی، قوت، حسن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لئے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائے

نصب العین کی محبت کا جذبہ اور حقیقت کائنات

اب غور فرمائیے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالق کائنات ہو اور بدرجہ کمال حسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہو۔ اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابل یقین اور حقائق معلومہ اور مسلّمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجہ کمال حسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوع انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح نصب العین) خود حقیقت کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں ۔ یہ ہے وہ ناقابل انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیا علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں ۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس کی دعوت کی ابتدا اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا : لا الٰہ الا اللہ ۔ خدا کے سوائے کوئی نہیں جو (اپنی صفات کی بنا پر) تمہاری محبت۔ ستائش ۔ پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا :-

یا ایھا الناس اعبدو ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم

اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

اسلام اور حقیقت کائنات کی صفات

قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم خدا کے لئے اللہ کا نام استعمال کریں یا رحمٰن کا یا کوئی اور نام۔ جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام حسین نام صرف اُس کے ہیں اور کسی دوسرے کے نہیں۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایّاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنٰی

اُسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ خواہ تم اُسے کسی نام سے پکارو (لیکن یاد رکھو کہ) تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔

وللہ الاسماء الحسنٰی فادعوہ بہا وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ

اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں پس ان ناموں سے اُسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں الحاد سے کام لیتے ہیں۔

جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے سو اہم نام گنائے ہیں جو نیچے درج کئے جاتے ہیں:-

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ

وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں

الرَّحْمٰنُ (بہت مہربان) — الرَّحِیْمُ (نہایت رحم والا)

المَلِکُ (بادشاہ) — القُدُّوْسُ (پاک ذات)

السَّلَامُ (سلامتی والا) — المُؤْمِنُ (امن دینے والا)

المُھَیْمِنُ (نگرانی کرنے والا) — العَزِیْزُ (غالب)

الجَبَّارُ (زبردست) — المُتَکَبِّرُ (بڑائی والا)

الخَالِقُ (بنانے والا) — البَارِئُ (پیدا کرنے والا)

المُصَوِّرُ (صورت بنانے والا) — الغَفَّارُ (بخشنے والا)

القَھَّارُ (دباؤ والا) — الوَھَّابُ (بہت دینے والا)

الرَّزَّاقُ (روزی دینے والا) — الفَتَّاحُ (کھولنے والا)

العَلِیْمُ (جاننے والا) — القَابِضُ (تنگ کرنے والا)

البَاسِطُ (کشادہ کرنے والا) — الخَافِضُ (پست کرنے والا)

اَلرَّافِعُ	(بلند کرنے والا)	اَلْمُعِزُّ	(عزت دینے والا)
اَلْمُذِلُّ	(ذلیل کرنے والا)	اَلسَّمِیْعُ	(سننے والا)
اَلْبَصِیْرُ	(دیکھنے والا)	اَلْحَکَمُ	(فیصلہ کرنے والا)
اَلْعَدْلُ	(انصاف کرنے والا)	اَللَّطِیْفُ	(مہربان)
اَلْخَبِیْرُ	(خبردار)	اَلْحَلِیْمُ	(بردبار)
اَلْغَفُوْرُ	(بخشنے والا)	اَلشَّکُوْرُ	(قدردان)
اَلْعَظِیْمُ	(عظمت والا)	اَلْعَلِیُّ	(بلندی والا)
اَلْکَبِیْرُ	(بڑائی والا)	اَلْحَفِیْظُ	(حفاظت کرنے والا)
اَلْمُقِیْتُ	(روزی پہنچانے والا)	اَلْحَسِیْبُ	(کفایت کرنے والا)
اَلْجَلِیْلُ	(بزرگی والا)	اَلْکَرِیْمُ	(عزت والا)
اَلرَّقِیْبُ	(نگہبان)	اَلْمُجِیْبُ	(قبول کرنے والا)
اَلْوَاسِعُ	(کشائش والا)	اَلْحَکِیْمُ	(حکمت والا)
اَلْوَدُوْدُ	(محبت کرنے والا)	اَلْمَجِیْدُ	(بڑی شان والا)
اَلْبَاعِثُ	(اٹھانے والا)	اَلشَّهِیْدُ	(حاضر)
اَلْحَقُّ	(سچا مالک)	اَلْوَکِیْلُ	(کام بنانے والا)
اَلْقَوِیُّ	(زور آور)	اَلْمَتِیْنُ	(قوت والا)
اَلْوَلِیُّ	(حمایت کرنے والا)	اَلْحَمِیْدُ	(خوبیوں والا)
اَلْمُحْصِیْ	(گننے والا)	اَلْمُبْدِئُ	(پہلی بار پیدا کرنے والا)
اَلْمُعِیْدُ	(دوبارہ پیدا کرنے والا)	اَلْمُحْیِیْ	(جلانے والا)
اَلْمُمِیْتُ	(مارنے والا)	اَلْحَیُّ	(زندہ)
اَلْقَیُّوْمُ	(سب کا تھامنے والا)	اَلْوَاجِدُ	(پانے والا)
اَلْمَاجِدُ	(عزت والا)	اَلْوَاحِدُ	(اکیلا)
اَلْاَحَدُ	(بے ہمتا)	اَلصَّمَدُ	(بے احتیاج)
اَلْقَادِرُ	(قدرت والا)	اَلْمُقْتَدِرُ	(مقتدر والا)
اَلْمُقَدِّمُ	(آگے کرنے والا)	اَلْمُؤَخِّرُ	(پیچھے کرنے والا)

اَلْاَوَّلُ (سب سے پہلا)	اَلْاٰخِرُ (سب سے آخر)
اَلظَّاهِرُ (ظاہر)	اَلْبَاطِنُ (پوشیدہ)
اَلْوَالِیْ (مالک)	اَلْمُتَعَالِیْ (بلند صفتوں والا)
اَلْبَرُّ (احسان کرنے والا)	اَلتَّوَّابُ (توبہ قبول کرنے والا)
اَلْمُنْتَقِمُ (بدلہ لینے والا)	اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا)
اَلرَّؤُفُ (نرمی کرنے والا)	اَلْغَنِیُّ (بے پرواہ)
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (عزت والا اور بخشش والا)	
اَلرَّبُّ (پروردگار)	اَلْمُقْسِطُ (انصاف کرنے والا)
اَلْجَامِعُ (اکٹھا کرنے والا)	مَالِكُ الْمُلْكِ (بادشاہی کا مالک)
اَلْمُغْنِیُ (بے پرواہ کرنے والا)	اَلْمَانِعُ (روکنے والا)
اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا)	اَلنَّافِعُ (نفع پہنچانے والا)
اَلنُّوْرُ (روشن کرنے والا)	اَلْهَادِیُ (ہدایت کرنے والا)
اَلْبَدِیْعُ (نئی طرح پیدا کرنے والا)	اَلْبَاقِیُ (باقی رہنے والا)
اَلْوَارِثُ (سب کا وارث)	اَلرَّشِیْدُ (نیک راہ بتانے والا)
اَلصَّبُوْرُ (صبر کرنے والا)	

نبوّت کی حقیقت

نبی وہ شخص ہوتا ہے جو انسان کے اصلی اور حقیقی نصب العین کا علم خدا کی وحی سے براہ راست حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے اندر اس بات کا ایک زبردست داعیہ محسوس کرتا ہے کہ اس علم کو اپنی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچائے۔

انسان کی کوئی فطرتی ضرورت ایسی نہیں ہوتی جس کی تکمیل یا تشفی کے لئے قدرت خود اپنی طرف سے اہتمام نہ کرتی ہو اور پھر قدرت کا یہ اہتمام ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اسے ترک کرکے کسی اپنے اہتمام سے اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ بلکہ فطرت کا یہ اہتمام اس ضرورت کی صحیح اور پوری تشفی کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔

جس طرح سے قدرت انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی بدنی ضروریات کی تشفی کرے،

اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی نفسیاتی یا روحانی ضروریات کی تشفی کرے۔ اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے۔ جس طرح سے قدرت اپنی پیدا کی ہوئی بعض قوتوں مثلاً سورج، بادل، ہوا اور زمین کو بروئے کار لاتی ہے تاکہ انسان ان کی مدد سے غلّہ پیدا کرکے اپنی بھوک کو مطمئن کرے اسی طرح وہ مظہر نبوت کو کار فرما کرتی ہے تاکہ انسان اُس کی معرفت صحیح نصب العین کا علم حاصل کرکے اپنی آرزوئے حسن کو مطمئن کرے۔

جس طرح انسان خود بخود اور قدرت کی اس مدد کے بغیر جو مظہر حیات مادی قوتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اپنی بھوک کو مطمئن نہیں کر سکتا اسی طرح سے وہ خود بخود اور قدرت کی اُس مدد کے بغیر جو نبوت کی صورت اختیار کرتی ہے نصب العین کی آرزو کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

نبوّت انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جو اُس کے لئے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتی ہے

تعلیم نبوت کی مطلق اہمیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لئے انسان کی آرزو نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ روکی جا سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پرواہی کی وجہ سے نبوت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لئے اس کی محبت کا جذبہ رک جائے یا دب کر ختم ہو جائے بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبت کرنے لگ جاتا ہے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے خواہ وہ کیسی ہی مضر صحت اور خطرناک ہو اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔

لاہور میں 'میثاق'
کے تقسیم کنندگان
میسرز التشہیر مایک: بیڈن روڈ لاہور

ملّتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام (۲)

خلاصۂ رموزِ بے خودی (مسلسل)

مرتبہ : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

(۱۲) حیاتِ ملیہ کے لئے ایک مرکزِ محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکز بیت الحرام ہے سب مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیئے۔ مکّہ واقعی ہمارا کعبہ مقصود ہے اور جسے مکّہ سے محبت نہیں اس کے ایمان میں خلل ہے۔ جو جماعت مکّہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہم چناں آئینِ میلادِ امم — زندگی بر مرکزے آید بہم[1]
قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے[2]
رازدار و رازِ ما بیت الحرام — سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام[3]
در جہاں مارا بلند آوازہ کرد — با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد[4]

(۱۳) تنظیمِ حقیقی کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ افرادِ ملّت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کی حصول میں منہمک ہو اور امّتِ محمدیؐ کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلغ اسلام ہے۔

---

[1] اُمتوں کی پیدائش کا قانون یہی ہے کہ زندگی کسی مرکز پر مجتمع ہوتی ہے۔
[2] قوم میں ربط اور نظام مرکز ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مرکز ہی سے اس کی زندگی میں دوام پیدا ہوتا ہے
[3] بیت الحرام (مکّہ) ہمارا رازدار بھی ہے اور راز بھی ہے اور بیت الحرام ہمارے لئے سوز بھی ہے اور ساز بھی ہے
[4] اسی نے ہم کو دنیا میں مشہور کیا اور اسی نے ہمارے حدوث سے قدم (ازلیت) کو وابستہ کر دیا۔

مدعا رازِ بقائے زندگی جمع سیماب قوائے زندگی[1]
چوں حیات از مقصدے محروم شود ضابط اسباب ایں عالم شود[2]
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل کیف و کم از دے پذیرد ہر عمل[3]
زانکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشر لا الہ مقصود تست[4]
تا نخیزد بانگ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے[5]

آجکل جبکہ الحاد اور مادیت کا زور ہے قرآنی تعلیمات کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔ موجودہ مشکلات کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ پس مسلمانوں کو بکمر تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں منہمک ہو جانا چاہیئے۔

(۱۴) حیات ملی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ عہدِ ماضی میں مسلمانوں کا یہی شعار رہا۔ لیکن اب علوم و فنون سے بے بہرہ ہیں۔ تحقیق و اجتہاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی درکنار تنزل کر رہے ہیں۔

ما سوا از بہر تسخیر است و بس سینۂ او عرصۂ تیر است و بس[6]
غنچۂ! از خود چمن تعمیر کن شبنمی خورشید را تسخیر کن[7]
خیز و واکن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را[8]
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است امتحانِ ممکناتِ مسلم است[9]

---

[1] مدعا ہی زندگی کے بقا کا راز ہے اور زندگی کی سیماب صفت قوتوں کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے۔

[2] جب زندگی کسی مقصد سے آشنا ہو جاتی ہے تو اس عالم کے اسباب کی ضابط ہو جاتی ہے۔

[3] مقصود عمل میں مثلِ روح پوشیدہ ہوتا ہے اور ہر عمل اسی سے اپنی کیفیت اور کمیت حاصل کرتا ہے۔

[4] چونکہ تیری ہستی کا راز تکبیر (اعلاء کلمۃ اللہ) میں پوشیدہ ہے اس لئے لا الہ الا اللہ کی حفاظت اور اشاعت تیرا فرض منصبی ہے۔

[5] جب تک ساری دنیا میں حق کی اشاعت نہ ہو جائے۔ اگر تو مسلمان ہے تو ایک لمحے کے لئے بھی آرام مت کرنا۔

[6] ماسوا (کائنات) تسخیر کے لئے ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا سینہ تیرے تیروں کا نشانہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔

[7] اگر تو غنچہ ہے تو اپنی ذاتی سعی سے چمن تعمیر کر اور اگر تو شبنم ہے تو آفتاب کو مسخر کر۔

[8] اٹھ اور اپنی مخمور آنکھیں کھول اور اس عالمِ مجبور کو بے قیمت اور بے کار مت سمجھ۔

[9] اس کا مقصد مسلمان کی ذات کی توسیع ہے اور مسلمان کی ذاتی قوتوں کا امتحان لینا ہے۔

حق جہاں را قسمت نیکاں شمرد جلوہ اش یا دیدۂ مومن سپرد[1]
تو کہ مقصودِ خطابِ "انظری" پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری[2]؟
علمِ اسما اعتبارِ آدم است حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است[3]

(۱۵) حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملت میں بھی فرد کی طرح اپنی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور اس احساس کی تولید اور تکمیل اپنی ملی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور اشاعت سے ممکن ہے۔

ملت میں خودی کے احساس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ بہبودِ ملت کا ذمہ دار ہو۔ اگر زید کو تکلیف پہنچے تو تمام جماعت اس تکلیف کو محسوس کرے۔ اس کا نظارہ دہلی نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جبکہ بارہ سپاہیوں اور اُن کے افسر نے بخوشی میگزین میں آگ لگا دی اور خود بھی اس میں جل کر مر گئے تاکہ وہ بارود ان کے دشمن اُن کے بھائیوں کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔ وہ بظاہر مر گئے لیکن بباطن زندہ ہیں اور لارڈ ولنگڈن سر ہربرٹ ایمرسن اور دوسرے گورنران صوبجات کی شکل میں آج ۱۹۳۳ء میں ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو ان کا ابھرنا اور ترقی کرنا معلوم۔ فی الحال تو یہ کیفیت ہے کہ ہندو سے زیادہ مسلمان مسلمان کا دشمن ہے۔ میونسپل کمیٹی اور کونسل سب جگہ منافرت اور منافقت کا بازار گرم ہے۔ *

اس احساس کو پیدا کرنے کے لئے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا اور اپنی روایاتِ ملی کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ زندہ اقوام اپنی روایات کی بہت حفاظت کرتی ہیں اور بچوں کے قلوب میں ان روایات کا نقش قائم کرتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہماری تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کلرکوں کی ضرورت ہے نہ کہ قومی درد رکھنے والوں کی۔

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تھا ڈبہ کا اور تعلیم تھی سرکار کی

---

[1] اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو نیکوکاروں کے حصے میں دے دیا ہے اور اس کا جلوہ مومن کی آنکھ کے حوالے کر دیا ہے۔

[2] تو کہ خطاب "انظر" کا مقصود ہے (اللہ نے انسان کو حکم دیا ہے کہ اونٹ کی تخلیق پر غور کرے) اس راستے (حیات دنیوی) کو اندھوں کی طرح کیوں طے کر رہا ہے؟ (کائنات میں غور کیوں نہیں کرتا؟)

[3] علم اسما ہی سے آدم کی اولاد کی عزت ہے اور حکمت اشیا سے آگاہی کی بنا پر ہی وہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔

ربطِ ایام است مارا پیرہن — سوزنش حفظِ روایاتِ کہن [۱]
چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ — داستانے قصۂ افسانۂ [۲]
این ترا از خویشتن آگہ کند — آشنائے کار و مردِ رہ کند [۳]
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال [۴]

(۱۶) بقائے نوع امومت (MOTHERHOOD) پر منحصر ہے اس لئے اسلام میں امومت کے احترام کو فرضِ عین قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے "عورت" کو بڑا بلند درجہ عنایت کیا ہے کیونکہ عورت مرد کے لئے باعث تسکین اور کائنات کے لئے موجب رونق ہے۔ مرد بھی عورت ہی کی وجہ سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مرد کے لئے موجب زینت و آسائش ہے اسی لئے آنحضرت صلعم نے خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔

جو مسلمان عورت کو اپنا خادم یا ماتحت خیال کرتا ہے وہ فہم قرآن سے محروم ہے۔ لکھتے ہیں:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات — ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ [۵]
مسلمے کو را پرستارے شمرد — بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد [۶]
نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت است [۷]
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است — سیرتِ اقوام را صورتگر است [۸]
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں — زیرِ پائے امہات آمد جناں [۹]

---

۱ ربطِ ایام ہمارے لئے بمنزلہ پیرہن ہے اور حفظِ روایاتِ کہن اس کے لئے بمنزلہ سوئی ہے۔

۲ اے کہ تو اپنے سے بیگانہ ہو چکا ہے، بتا تو سہی کہ تاریخ ہے کیا؟ کیا یہ کوئی داستان یا قصہ یا افسانہ ہے؟

۳ نہیں بلکہ یہ تجھے تجھ سے آگاہ کرتی ہے۔ تجھے آشنائے کار اور مردِ راہ بناتی ہے۔

۴ اگر تو حیاتِ لازوال چاہتا ہے تو اپنے ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے مت توڑ۔

۵ وہ جس کے وجود پر کائنات ناز کرتی ہے اس نے عورت کا ذکر خوشبو اور نماز کے ساتھ کیا ہے۔

۶ جس مسلمان نے عورت کو کنیز سمجھا وہ قرآنی حکمت سے کوئی حصہ حاصل نہ کر سکا۔

۷ اگر تو غور سے دیکھے تو امومت ایک رحمت ہے کیونکہ اس کو نبوت سے ایک نسبت حاصل ہے۔

۸ عورت کی شفقت پیغمبر کی شفقت سے مشابہ ہے اور اقوام کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔

۹ اس مقصودِ حرف "کن فکاں" نے فرمایا ہے کہ جنت تو ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

ملّت از تکریم ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس[1]

حافظِ رمزِ اخوّت مادراں قوّتِ قرآن و ملّت مادراں[2]

(۱۷) عورتوں کے لئے سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء اُسوہ حسنہ ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول مادراں را اسوۂ کامل بتول[3]

آن ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گردان و لب قرآن سرا[4]

(۱۸) خطاب بہ مخدراتِ اسلام۔ علامہ مسلمان عورتوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ مادرانِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے اسلام اور اسلامی روایات سے آگاہ کریں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔ وہ ذمہ دار ہیں اور بچوں کی سیرت انہی کے سانچہ میں ڈھلتی ہے۔

موجودہ زمانہ بڑا پرآشوب ہے کفر و الحاد کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماؤں کو چاہیئے کہ مسلمان بچوں کو قرآنی تعلیمات سے مسلح کرکے کارزارِ عالم میں بھیجیں۔

کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست لا الٰہ آموختی او را نخست[5]

می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما فکرِ ما گفتارِ ما کردارِ ما[6]

دورِ حاضر تر فروش و پُر فن است کارِ دانش نقدِ دیں را رہزن است[7]

کور و یزداں ناشناس ادراکِ اُو ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ اُو[8]

ہوشیار از دستبردِ روزگار گیر فرزندانِ خود را در کنار[9]

---

[1] ملّت کا وجود ماؤں کی تعظیم پر موقوف ہے ورنہ کارِ زندگی خام ہے۔

[2] مائیں رمزِ اخوّت کی محافظ ہوتی ہیں۔ اور قرآن اور ملّت کے حق میں ان کا وجود باعثِ تقویت ہوتا ہے۔

[3] بتول تسلیم کی کھیتی کا حاصل ہے اور ماؤں کے لئے اسوۂ کاملہ ہے۔

[4] وہ صبر و رضا کی ادب پروردہ چکّی پیستی رہتی تھی اور قرآن کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔

[5] ہمارا بچہ جب تیرا دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو سب سے پہلے تو ہی اسے لا الٰہ الا اللہ کہنا سکھاتی ہے۔

[6] تیری ہی محبت ہمارے اطوار کی تشکیل کرتی ہے اور ہماری گفتار، فکر اور کردار کی تشکیل کرتی ہے۔

[7] دورِ حاضر بہت عیّار اور مکّار ہے اس کا کاروان نقدِ دیں کے لئے بمنزلہ رہزن ہے۔

[8] اس کا ادراک اندھا اور خدا ناشناس (خدا کا منکر) ہے اور کم عقل افراد اس کے پیچاک میں گرفتار ہیں۔

[9] اے مسلمان خاتون! دنیا کے ہنگاموں سے ہوشیار رہ اور اپنے بیٹوں کو اپنی آغوش میں محفوظ کرلے۔

(۱۹) آخر میں علامہ نے سورہ اخلاص کی تفسیر اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ میں اس کا خلاصہ بھی طوطیائے چشم بناتا ہوں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیق اکبرؓ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے کہا کہ اُمتِ مرحوم کی بہبود کی کوئی صورت بتائیے انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو سورہ اخلاص سے آب و تاب حاصل کرنی چاہیئے۔

توحید کا رنگ پیدا کر لو سارے عقدے حل ہو جائیں گے۔

با یکی ساز از دوئی بردار رخت ‏ ‏ ‏ وحدتِ خود را مگردان لخت لخت[1]

خدا نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا وہ اب ترک، افغان اور ہندی بنے ہوتے ہیں۔ قل ھو اللہ احد کے معنی زبان سے ادا کرنے سے کام نہیں بنتا۔ جب تک مسلمان وحدت کا رنگ اپنے اندر نہ پیدا کریں۔ جس طرح اُن کا خدا ایک ہے اسی طرح انہیں بھی ایک ہونا چاہیئے۔

یک شو و توحید را مشہود کن ‏ ‏ ‏ غائبش را از عمل موجود کن[2]

لذت ایماں فزاید در عمل ‏ ‏ ‏ مُردہ آن ایماں کہ ناید در عمل[3]

(ب) اللہ الصمد کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے تم بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کو کعبہ مقصود بنا لو۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست ‏ ‏ ‏ زندگانی گردش دولاب نیست[4]

مسلم استی بے نیاز از غیر شو ‏ ‏ ‏ اہل عالم را سراپا خیر شو[5]

راہ دشوار است ساماں کم بگیر ‏ ‏ ‏ در جہاں آزاد زی آزاد میر[6]

---

[1] ایک ہو جا اور ایک سے موافقت پیدا کر۔ دوئی سے تعلق قطع کر لے۔ اپنی وحدت کو پارہ پارہ مت کر۔

[2] ایک ہو جا اور توحید کو دیکھ لے اور اس کے غائب کو اپنے عمل سے موجود کر لے۔

[3] عمل میں ایمان کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جو عمل میں منتقل نہیں ہوتا۔

[4] بندۂ حق بندۂ اسباب نہیں ہوتا۔ زندگانی رہٹ کی گردش نہیں ہے۔

[5] تو (چونکہ) مسلمان ہے اس لئے غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا اور اہل عالم کے حق میں سراپا خیر و برکت بن جا۔

[6] چونکہ راہ بہت دشوار ہے اس لئے کم سے کم سامان اپنے ساتھ رکھ۔ اس دنیا میں آزاد ہو کر زندہ رہ اور آزادی کی حالت میں رخصت ہو۔

پشت پا زن تختِ کیکاؤس را — سر بدہ از کف مدہ ناموس را[1]
بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است — رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است[2]
آفتابستی یکے در خود نگر — از نجومِ دیگراں تابے مخر[3]
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے — ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے[4]

(ج) جس طرح اللہ تعالیٰ لم یلد و لم یولد ہے اُسی طرح مسلم رنگ و خون سے بالاتر ہے۔ اسلام میں حسب و نسب، رنگ، قوم، ذات پات، نسل، زبان، دولت ثروت یہ سب ہیچ ہیں۔

فارغ از باب و اُم و اعمام باش — ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش[5]
گر نسب را جزوِ ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اخوت کردۂ[6]
دل بہ محبوبِ حجازیؐ بستہ ایم — زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم[7]
رشتۂ ما یک تولّا بیش نیست — چشمِ ما را کیفِ صہبایش بس است[8]
عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتۂ عشق از نسب محکم تر است[9]
ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است — بے خبر از لم یلد لم یولد است[10]

(د) ولم یکن لہ کفواً احد کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

---

[1] کیکاؤس کے تخت پر لات مار دے۔ سر (گردن) کٹا دے مگر عزتِ نفس کو ہاتھ سے مت دے
[2] بے نیازی کیا ہے؟ خدا کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا اور غیر کے رنگ کو اپنی شخصیت سے مٹانا۔
[3] تو دراصل آفتاب ہے۔ کبھی اپنے اندر تو جھانک۔ دوسروں کے ستاروں سے چمک دمک حاصل مت کر
[4] تو کب تک محفل کے چراغ کا طواف کرتا رہے گا؟ اگر تیرے سینے میں دل ہے تو اپنی آگ میں جل۔
[5] باپ، ماں اور چچاؤں (نسبی تعلقات) سے فارغ ہو جا اور سلمانؓ کی طرح اسلام کا فرزند بن جا۔
[6] اگر تو نسب کو جزوِ ملت بنائے گا تو اخوت کے نظام میں رخنہ پڑ جائے گا۔
[7] ہم نے تو محبوبِ حجازیؐ سے عشق کر لیا ہے اسی لئے ہم آپس میں مربوط ہو گئے ہیں۔
[8] صرف آپؐ سے محبت ہمارے باہمی تعلق کے لئے کافی ہے اور ہماری آنکھوں کے لئے صرف اس کی شراب کی کیفیت کافی ہے
[9] عشق جان میں ہوتا ہے جبکہ نسب جسم میں ہوتا ہے اور عشق کا رشتہ نسب سے محکم تر ہوتا ہے۔
[10] جو شخص بھی باپ دادا کی قید میں ہے وہ لم یلد و لم یولد کے نکتے سے ناواقف ہے۔

رشتہ با لم یکن باید قوی | تا تو در اقوام بے ہمتا شوی[1]
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک | بندہ اش ہم در نسازد با شریک[2]
خرقۂ لا تحزنوا اندر برش | انتم الاعلون تاجش بر سرش[3]
پیش باطل تیغ و پیش حق سپر | امر و نہی او عیار خیر و شر[4]
خوار از مہجوریٔ قرآں شدی | شکوہ سنج گردش دوراں شدی[5]
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ | در بغل داری کتاب زندۂ[6]

(۲۰) عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ

اس آخری باب میں علامہ نے سرکار مدینہؐ سے عرض کی ہے کہ حضورؐ! مسلمان سِرّ نبیؐ سے بیگانہ ہو گیا ہے، اس نے عرب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کر لی ہے۔ میں نے اُسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

محفل از شمع نوا افروختم | قوم را رمز حیات آموختم[7]

لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است | در بحرفم غیر قرآں مضمر است[8]

---

[1] ہمارا رشتہ "لم یکن" سے قوی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ہم اقوام عالم میں بے مثال ہو سکتے ہیں۔

[2] چونکہ خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے۔ اس لئے اس کا بندہ بھی کسی شریک سے موافقت نہیں کر سکتا۔

[3] اس کے جسم پر "لا تحزنوا" کا خرقہ ہوتا ہے اور "انتم الاعلون" کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔

[4] بندہ مومن باطل کے سامنے بمنزلہ تلوار اور حق کے سامنے بمنزلہ سپر ہوتا ہے اور اس کا امر و نہی خیر و شر کے لئے بمنزلہ معیار ہوتا ہے۔

[5] تو قرآن کو ترک کر کے دنیا میں ذلیل و خوار ہو گیا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر گردش دوراں کا شکوہ کرنے لگا۔

[6] اے شبنم کی طرح زمین پر گرنے والے مسلمان! آگاہ ہو کہ قرآن تیری بغل میں ہے جو زندہ کتاب ہے۔

[7] میں نے شاعری کی شمع سے محفل آراستہ کی اور قوم کو حیات کا راز بتایا۔

[8] اگر میرا دل آئینہ بے جوہر (بیاد) ہے اور اگر میرے کلام میں کوئی تعلیم غیر قرآنی ہے۔

پردۂ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن[1]
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[2]

اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو پھر اتنی درخواست ہے۔

عرض کن پیش خدائے عزوجل عشق من گردد ہم آغوش عمل[3]

سب سے آخر میں علامہ نے سرکار مدینہ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زندگی را از عمل ساماں بنود پس مرا ایں آرزو شایاں نبود[4]
بست شانِ رحمت گیتی نواز آرزو دارم کہ میرم در حجاز[5]
از درت خیزد اگر اجزائے من وائے امروزم خوشا فردائے من[6]
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش مرقدے در سایۂ دیوار بخش[7]

علامہ کی یہ دعا اس قدر رقت آمیز ہے کہ کوئی صاحب دل بغیر چشم تر کئے اسے ختم نہیں کر سکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقان رسول ﷺ کو بھی یہ سعادت نصیب ہو۔ آمین۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد (ختم شد)

---

[1] تو میری فکر کے ناموس کا پردہ چاک کر دیجئے اور ملت کے خیاباں کو میرے کانٹوں سے پاک کر دیجئے

[2] نیز قیامت کے دن مجھے خوار اور رسوا کر دیجئے اور اپنے پاؤں کے بوسے سے محروم کر دیجئے۔

[3] بارگاہ ایزدی میں عرض کیجئے یعنی میرے لئے دعا کیجئے کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہو جائے۔

[4] چونکہ میری زندگی اعمال صالحہ سے خالی ہے اس لئے مجھے یہ آرزو زیب تو نہیں دیتی (مگر)

[5] آپ کی شان رحمت تو گیتی نواز ہے (اس لئے) آرزو کرتا ہوں کہ میں حجاز میں وفات پاؤں

[6] اگر میرے جسم کے اجزا آپؐ کے دروازے سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں تو اگرچہ میری موجودہ زندگی قابل افسوس ہے مگر آئندہ زندگی قابل تحسین ہو جائے گی۔

[7] میرے ستارے (مقدر) کو دیدۂ بیدار عطا فرما۔ اور اپنی دیوار کے سائے میں دو گز زمین عطا فرما۔

(بقیہ تدبر قرآن)

کی بات جو لوگ مانیں گے وہ خدائی راہ سے بھٹکے رہیں گے۔ اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ۔ یہ خطاب بھی عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بھیڑ کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ پتہ اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں۔ پس جن کو خدا راہ یاب بتا رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت یافتہ گروہ کے لئے بشارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے تہدید بھی ہے جو گمراہی کی راہ پر چل رہے ہیں اس لیے کہ جب اللہ ان دونوں گروہوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔ ان لوگوں کے دعوے کچھ کام نہیں آئیں گے جو ہیں تو گمراہ لیکن علم بردار بنے ہوئے ہیں ہدایت کے۔

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

• اسلامی قانون کی تدوین

صفحات: ۱۶۰ قیمت ۴ روپے
سستا ایڈیشن " ۲ "

• تزکیۂ نفس

صفحات: ۳۴۴
قیمت: ۱۰/- روپے

تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ

بڑا سائز: صفحات ۳۶

ھدیہ: ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ لاہور

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ (۳)

تعلیمات (۲)

جنیدؒ کا نظریۂ فناء

جنید کے یہ دونوں نظریے (نظریۂ میثاق و نظریۂ فنا) ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، یعنی توحید کی اعلیٰ حالت۔ پس جو موحد اس اعلیٰ حالت کے حصول کا آرزو مند ہو اسے اپنے اوپر فنا طاری کرنی پڑے گی۔ خدائی ہستی حاصل کرنے کے لئے اُسے انسانی ہستی سے سبکدوش ہونا لازمی ہے۔ اسی صورت میں وہ خدا کے ساتھ ہو کر وحدت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ جنید نے فنا کی تین منزلیں قرار دی ہیں۔

پہلی منزل : فنائے صفات و خصائص ذاتی و اوصاف طبعی ہے تاکہ بندہ اتباع شریعت میں اپنی خواہشات کے بجائے اللہ کی مرضی پر عامل ہو سکے اور اپنے نفس امارہ کی خواہشوں کو فنا کر کے احکام خداوندی پر عمل کر سکے۔

دوسری منزل یہ ہے کہ بندہ لذات حسی سے بکلی کنارہ کش ہو جائے بلکہ لذت جسمانی کی خواہش کو بھی فنا کر دے تاکہ وہ بکلی اللہ کے لئے ہو جائے اور غیر سے کوئی علاقہ باقی نہ رہے۔

تیسری منزل یہ ہے کہ یہ شعور بھی فنا ہو جائے کہ مجھے خدا کی حضوری حاصل ہے۔ اس حالت کے بعد بندہ صرف اللہ کے لئے زندگی بسر کرتا ہے وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگرچہ مادی جسم باقی رہتا ہے مگر شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔

پہلی منزل کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ یعنی بندہ اپنی ذاتی اور نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور سچے مسلم کی حیثیت سے اللہ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اس کے لئے اسے مسلسل مجاہدہ کرنا لازمی ہے تاکہ وہ خالص زاہدانہ زندگی بسر کر سکے۔ فنا کی یہ منزل سالک کی اخلاقی اور ظاہری زندگی سے متعلق ہے۔

فنا کی دوسری منزل کا مطلب یہ ہے کہ سالک لذات جسمانی سے بکلی قطع تعلق کرلے بلکہ جب وہ اتباع

شرلعیت کرے تو اس پر کسی فخر و مباہات کا اظہار بھی نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے بھی اسے ذہنی لذت حاصل ہوگی۔ فنا کی یہ منزل سالک کی ذہنی اور باطنی زندگی سے متعلق ہے۔

تیسری منزل کا مفہوم یہ ہے کہ سالک کو اس بات کا شعور بھی نہ رہے کہ مجھے حضوری کی عزت حاصل ہو گئی ہے۔ خدا کی حضوری میں اس کا اپنا ظاہری وجود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اس منزل میں سالک کی شخصیت خدا میں گم ہو جاتی ہے اگرچہ بظاہر وہ لوگوں کو چلتا پھرتا نظر آتا ہے مگر درحقیقت اس کا ذاتی تشخص فنا ہو چکا ہوتا ہے اب وہ خدا میں اور خدا ہی کے لئے زندہ رہتا ہے جہاں تک اس کا تعلق ہے اس کی کوئی انفرادی ہستی باقی نہیں رہتی۔ خدا میں فنا ہو کر وہ ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ وہ صرف خدا کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔[۱]

فنا کی آخری منزل میں پہنچ کر سالک باقی باللہ کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یعنی بقا باللہ، فنا فی اللہ کا ثمرہ ہے۔ فنا کا مطلب وہ نہیں ہے جو بدھ مذہب میں "نروان" کا ہے۔ یعنی فنائے ذات بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کو فنا کر کے ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جانا اور خدا میں زندہ رہ کر زندگی بسر کرنا۔　　(کتاب اللمع صفحہ ۲۱۴)

الغرض جنید کا مطلب فنا سے فنائے کلی (نروان) نہیں ہے بلکہ وہ حالت جس میں سالک اللہ کے ساتھ بقا کی نعمت سے سرفراز ہو جاتا ہے اور اللہ کے　　ابدی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن جنید کہتے ہیں کہ "اس بقا باللہ کی حالت میں بھی سالک ذات باری کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ خدا کے ساتھ تو ہے مگر خدا نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔[۲] اس ابدی حالت میں بھی بندہ، بندہ ہی رہتا ہے۔ خدا وراء الوراء ہے۔ کوئی بندہ کُنہ ایزدی[۳] سے آگاہ نہیں ہو سکتا اور نہ خدا سے متحد ہو سکتا ہے۔[۴]"　　(رسالہ ۶)

اس تصریح سے واضح ہو گیا ہے کہ جنید نے غیر اسلامی عقیدۂ اتحاد سے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ چونکہ اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید بندہ خدا سے متحد ہو کر خود بھی خدا بن جاتا ہے اس لئے جنید نے اس کی وضاحت کر دی کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بندہ بہرحال بندہ رہتا ہے۔[۵]

الغرض فنا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ خدا بن جاتا ہے یا خدا میں مل کر خدا ہو جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب

لہ کلُّ شئٍ ہالکٌ جز وجہِ او　　گر نۂ در وجہ او، ہستی مجو　　(رومیؒ)

آنکہ حیٌّ لا یموت آمد حق است　　زیستن با حق حیات مطلق است　　(اقبال)

ٮه العبدُ عبدٌ و اِن ترقّیٰ والربُّ ربٌّ و اِن تنزّل　　(شیخ اکبرؒ)

ٮه تو ان در بلاغت بسحباں رسید　　نہ در کنہ بیچون سبحاں رسید　　(سعدیؒ)

ٮه حلول و اتحاد ایں جا محال است　　کہ در وحدت دوئی عین ضلال است　　(شبستری)

ھ　　(بیدلؒ)

صرف یہ ہے کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی میں فنا ہو جاتی ہے۔ جنید نے فنا کی جو تعلیم دی ہے اس میں یہ نکتہ خاص طور سے اہم اور لائق توجہ ہے کیونکہ زمانۂ مابعد کے بعض صوفیہ اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر جنید کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے اور گمراہ ہو گئے۔ چنانچہ ابو نصر سراج نے لکھا ہے کہ " بغداد کے بعض صوفیوں نے فنا کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ جب سالک ذاتِ باری میں فنا ہو جاتا ہے تو خدائی صفات سے متصف ہو کر خدا بن جاتا ہے لیکن یہ عقیدہ سراسر کفر ہے کیونکہ اس کا مطلب "حلول" ہے اور حلول کا عقیدہ تو نصاریٰ کا ہے جو کافر ہیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ خدا مسیح میں مجسم ہو گیا[1]۔ فنا کا مفہوم یہ ہے کہ جب بندہ اپنی صفاتِ ذاتی کو فنا کر دیتا ہے اور خدا کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے تو وہ اپنی مرضی کے بجائے اللہ کی مرضی پر چلتا ہے۔ گویا فنا کا مطلب ہے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دینا اور اس کی کامل اطاعت کرنا اور یہ توحید کی آخری منزل ہے" (کتاب اللمع صفحہ ۴۳۲)

ابو نصر سراج نے لکھا ہے " بعض صوفیہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کھانے پینے سے اجتناب کیا جائے اور مختلف ریاضتوں سے جسم کو کمزور کر دیا جائے تو انسان میں صفاتِ ایزدی پیدا ہو جائیں گی لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ انسان خواہ کچھ بھی کرے اخلاقِ ذاتیہ اس سے دور نہیں ہو سکتے جس طرح سیاہ رنگ سے سیاہی دور نہیں ہو سکتی" (کتاب اللمع صفحہ ۴۲۶)

جنیدؒ نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ فنا فی اللہ ہو جانے کے بعد بھی انسان انسان ہی رہتا ہے خدا نہیں بن سکتا۔ انہوں نے حلول اور اتحاد دونوں غیر اسلامی عقیدوں کی تردید کی ہے۔ فنا کا مطلب صرف یہ ہے کہ سالک کی اپنی مرضی باقی نہ رہے بلکہ خدا کی مرضی اس کی مرضی بن جائے۔ موحد وہ ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کو بالکلیہ خدا کے تابع کر دے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا میرے جسم میں حلول کر گیا ہے وہ کافر ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ میں اور خدا متحد ہو گئے ہیں وہ بھی کافر ہے۔ حلول اور اتحاد دونوں عقیدے سراسر الحاد ہیں۔ اسلامی تصوف میں جنید کا مقام یہ ہے کہ انہوں نے توحید کی تعلیم کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا جس پر کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اُن کے بعد صوفیہ نے توحید پر جو کچھ لکھا اس میں انہی کی تعلیم کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اسی لئے وہ سید الطائفہ کہلاتے ہیں۔

جنیدؒ کا عقیدۂ صحو

جو لوگ مقام توحید پر فائز ہوتے ہیں یعنی خدا کی حضوری میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کی اپنی مرضی باقی نہیں رہتی وہ خدا کے ہاتھ میں بمنزلہ آلہ ہوتے ہیں وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے کیونکہ ان کی مرضی، مرضیِ حق میں

[1] لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم

فنا ہو چکی ہے۔

اس عقیدے میں ایک خطرہ یہ لاحق ہوتا ہے کہ سالک یہ خیال کر سکتا ہے کہ جب میری کوئی مرضی ہی باقی نہیں رہی تو احکام شرع بھی مجھ سے ساقط ہو گئے۔ میں اوامر و نواہی سے بالاتر ہو گیا ہوں۔ یہ احکام تو دنیا والوں کے لئے ہیں نہ کہ میرے لئے۔ وقس علی ہذا۔ یہ غلط خیال خود جنید کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک شخص نے اُن سے کہا کہ بعض صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ عمل سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔" جنید نے جواب دیا کہ "جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ خطا کار ہیں۔ جو صوفی احکام شرع سے روگردانی کرے وہ سخت گنہ گار ہے۔ تصوف تو سراسر اتباع شرع ہے ایک زانی بھی ایسا عقیدہ رکھنے والے سے بہتر ہے۔ اگر میں ایک ہزار برس تک زندہ رہوں تو بھی اتباع احکام الٰہیہ کرتا رہوں گا۔"

جنید کا یہی قول ان کے اخلاقی نظریہ صحو کی بنیاد ہے جس طرح توحید ان کے علمی یا فلسفیانہ نظریے کی۔ اور جنید کا نظام تصوف انہی دو نظریوں پر مبنی ہے۔ چنانچہ ہجویری لکھتے ہیں کہ "جنید کا نظریہ صحو بہت مشہور و معروف ہے اور تمام شیوخ نے اسے اختیار کیا ہے (کشف المحجوب صفحہ ۱۸۹) جنید نے اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ نظریہ فنا سالک کی آخری منزل نہیں ہے۔ اگر سالک جذب یا سکر سے مغلوب ہو جائے تو اسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ پھر وہ اُن فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جو معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عاید ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ اپنے بندے سے اس بات کا بھی طالب ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں رہتا ہے اس کے حقوق و فرائض پوری توجہ سے ادا کرے۔ جب بندہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ کے مقام کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ حالت سکر سے حالت صحو میں واپس آجاتا ہے اور فنا کے بعد پھر انسانی یا انفرادی صفات اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ اس کی شخصیت میں صفات ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اس لئے وہ دوسرے ہم جنسوں کے لئے اسوہ (نمونہ) بن جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال سے دوسروں کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ بھی اس کی طرح صحیح معنی میں شریعت کا اتباع کریں۔" (رسالہ ۸)

پس کوئی شخص صحیح معنی میں شیخ طریقت نہیں بن سکتا جب تک وہ حالت صحو میں واپس آکر اپنے عمل سے لوگوں کو شریعت کے اتباع کا درس نہ دے۔ ایسا شیخ بیک وقت خدا کی معیت (حالت جذب) اور بندوں کی معیت (حالت صحو) میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی میں خدا کے ساتھ رہتا ہے اور ظاہری زندگی میں بندوں کے ساتھ۔ وہ کہتے ہیں "خدا اپنے محبوب بندوں کو پہلے اپنا قرب عطا کرتا ہے اس حالت میں وہ دنیا والوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں پھر خدا انہیں اپنے سے جدا کر دیتا ہے تاکہ وہ دنیا والوں سے رابطہ قائم کر سکیں اور انہیں راہ راست دکھا سکیں۔ یعنی ان کی زندگی غیب و حضور دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ دنیا سے غائب ہو کر

حضورِ حق میں ہوتے ہیں اور حق سے غائب ہو کر دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔" (رسالہ ۵)

صوفی حالتِ صحو میں اس لئے واپس آتا ہے کہ وہ خدمتِ خلق کر سکے کیونکہ یہی اس کا وظیفۂ حیات ہے۔ حضورِ حق سے واپس آ کر صوفی وہ نعمانسانوں میں تقسیم کرتا ہے جو اسے حالتِ سُکر میں بارگاہِ ایزدی سے ملتی ہیں وہ طالبانِ علم کو علومِ شرعیہ کا درس دیتا ہے۔ طالبانِ حق کو حق سے ملنے کی راہ سجھاتا ہے، حسبِ توفیق عوام سے ہمدردی کرتا ہے ان کو راحت پہنچاتا ہے مختصر یہ کہ وہ دوسروں کے لئے جیتا ہے اور اپنی پاکیزہ زندگی سے عوام کے سامنے سچے مومن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

حالتِ فنا (جذب یا سُکر) اور حالتِ بقا (ہوشیاری یا سلوک) کا یہ امتزاج کوئی آسان بات نہیں ہے یہ مقامِ الٰہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنا فضل و کرم نازل کرتا رہتا ہے۔ اس حالت میں سالک حقیقی حریت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے یعنی نہ اس پر خوف طاری ہوتا ہے نہ حزن۔ دنیا کا کوئی حادثہ اس کے اطمینانِ قلب کو زائل نہیں کر سکتا۔ اگر اسے قارون کا خزانہ مل جائے تو خوشی نہیں ہوتا اور اگر فاقوں کی نوبت آجائے تو رنجیدہ نہیں ہوتا۔ فقر و غناء دونوں حالتوں میں یکساں رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر مجھے غناء دنیوی میسر ہو گئی تو اللہ کے حکم سے ہوئی ہیں اور اگر چلی گئی ہیں تو اُسی کے حکم سے۔ اگر وہ جلوت میں ہے تو بھی اس کا دل اللہ کی طرف راغب ہے اور اگر خلوت میں ہے تو بھی[1]

فانی فی اللہ ہو کر سالک کی جو باطنی کیفیت ہوتی ہے اس کا نقشہ جنید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے "ایک زمانہ وہ تھا جب باشندگانِ ارض و سما میرے حال زار پر روتے تھے پھر وہ زمانہ آیا جب میں ان کے حال زار پر روتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ نہ مجھے ان کی خبر ہے نہ اپنی۔" (دیکھو کشف المحجوب صفحہ ۲۵۵ ترجمہ انگلسن)

جنید نے بایزید بسطامیؒ کے مسلکِ سُکر کے خلاف مسلکِ صحو کو بڑی شد و مد کے ساتھ اس لئے پیش کیا کہ اول الذکر مسلک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کا تعلق عوام سے منقطع ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی راہبانہ ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہجویری نے آخر الذکر مسلک کی تائید کی ہے جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی جب ہم کشف المحجوب کا تذکرہ کریں گے۔

خلاصہ کلام انیکہ جنید کا یہ مسلک تصوف کی تاریخ میں یکتا ہے انہوں نے مسلکِ صحو کو سُکر پر ترجیح دے کر اُن مفاسد کا سدباب کر دیا جو حالتِ سُکر میں مبالغہ کرنے یا اسے ترجیح دینے سے پیدا ہو سکتے تھے اور فی الواقع پیدا ہوئے۔ چنانچہ شروع سے لے کر آج تک مجذوبوں کو سالکوں پر فوقیت دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو مجذوب ہے وہ سچا "اللہ والا" ہے۔ بالفاظ دگر اہل اللہ کی پہچان ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ مجذوب ہو

[1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی نکتہ سمجھایا ہے "لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ"

جاتیں۔ پھر عوام نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ انہوں نے مجنونوں کو بھی مجذوبوں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ چنانچہ جب کوئی پاگل انہیں گالیاں دیتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور ان کی عقیدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جنید نے مسلک صحو پر زور دے کر بلاشبہ تصوف کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔

معرفتِ باری تعالیٰ

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کی معرفت بذریعہ عقل حاصل نہیں ہو سکتی۔ عقل تو محسوسات میں چل سکتی ہے اور خدا وراء المحسوسات ہے۔ خدا غیر مادی ہی نہیں ہے بلکہ وہ منطق کی گرفت سے بھی باہر ہے۔ علم باری تعالیٰ جسے صوفیہ اپنی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں اس بات پر موقوف ہے کہ بندہ اللہ کو راضی کرلے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرے گا۔ یعنی اسے وہ باطنی قوت عطا فرمائے گا جس کی بدولت اسے مشاہدۂ ذات ہو سکے گا۔ مختصر یہ کہ خدا کی معرفت استدلال سے نہیں بلکہ کشف و الہام سے حاصل ہو سکتی ہے۔

صوفیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حصولِ معرفت ہی صوفی کا مقصدِ حیات ہے اور جو شخص معرفت حاصل کرلے اسے عارف کہتے ہیں یعنی اس نے خدا کو پہچان لیا جس طرح وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ معرفت کے بغیر کوئی سالک اللہ سے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ محبت کے لئے معرفت شرط اولیں ہے اسی لئے معرفت کا درجہ علم سے بالاتر ہے۔

بقول قشیری "جب سالک کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ نفس امارہ کی غلامی سے بکلی آزاد ہو جاتا ہے اور یک سوئی کے ساتھ اللہ کی اطاعت کر سکتا ہے۔ (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۴۲)

جنید کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ وہ علم اور معرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عوام اور خواص کے علم باری تعالیٰ میں مدارج کا فرق ضرور ہے۔ خدا کے متعلق عوام کا علم ادنیٰ درجے کا ہے، خواص کا علم اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔

علما یہ کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعے سے خدا کا علم حاصل ہو سکتا ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ یہ علم ناقص ہوتا ہے۔ صحیح علم یعنی معرفت عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ قلب کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے یعنی صوفیہ علم اور معرفت میں فرق کرتے ہیں۔ جنید ان میں اصولاً فرق نہیں کرتے صرف مدارج کا فرق تسلیم کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "اولیا کا علم علما کے علم سے برتر اور عمیق تر ہوتا ہے مگر کامل علم نہ علما کو حاصل ہو سکتا ہے نہ اولیا کو۔ جو لوگ سب سے زیادہ عارف ہیں وہی سب سے زیادہ اپنے قصورِ فہم کے معترف ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ اور بندے میں تباین کی نسبت ہے یعنی اللہ خالق ہے بندہ مخلوق ہے۔ اللہ قدیم ازلی اور ابدی ہے بندہ حادث فانی اور ہالک ہے۔ اللہ حق ہے بندہ محض نمودِ بے بود ہے۔ اللہ قادرِ مطلق اور عالم الغیب ہے۔ بندہ عاجز

اور جاہل ہے۔

ہمارے علم باری کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ ہم اس کی احدیت کا اقرار کریں اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر تقویٰ اللہ، زہد و ورع اور پاک قلب و نظر پیدا ہو جائے اور ہم ہر شے میں اسی جلوہ کو دیکھیں اور ہر وقت اس کی حمد و ثنا کرتے رہیں اور اسے اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رکھیں"

جنید کی رائے میں خدا کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ عقل ہی ہے لیکن عقول میں تفاوت پایا جاتا ہے اسی لئے جو زیادہ عاقل ہے وہ زیادہ عالم ہے۔ انہوں نے خدا کے متعلق بندوں کے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

پہلا علم استدلال کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے دوسرا وجدان کے وسیلے سے چنانچہ انہوں نے مکتوب نہم میں اس کی صراحت کی ہے۔

خلاصہ کلام انیکہ پہلی منزل میں سالک عقل کے ذریعے سے علم حاصل کرتا ہے اور اعلیٰ سطح پر وجدان سے اس کی تائید مزید ہو جاتی ہے لیکن جب وہ توحید کی منزل میں پہنچتا ہے تو اس کی شخصیت پر فنا طاری ہو جاتی ہے اور اس مقام میں عقل و خرد کا گزر نہیں ہو سکتا[1] چنانچہ وہ کہتے ہیں "جب سالک بحر توحید میں غرق ہو جاتا ہے تو عقل کی روشنی میں اس کا بیان نہیں کیا جا سکتا (عقل اس حالت کا ادراک نہیں کر سکتی) بلکہ اس منزل میں موحد عقل کے ارشادات یا تر غیبات دونوں کو رد کر دیتا ہے۔ عقل بے چاری سالک کی اس نئی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتی جو اسے فنا فی اللہ ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ غریق بحر وحدت ہو کر سالک کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے (جس طرح آگ میں پڑ کر لوہا بھی آگ ہو جاتا ہے) اور عقل اس حالت مستقبلہ کا ادراک نہیں کر سکتی۔ حق یہ ہے کہ جب سالک مقام توحید پر فائز ہوتا ہے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں انفرادیت کے مظاہر خارجی باقی رہتے ہیں یعنی وہ حاضر بھی ہوتا ہے غائب بھی اور عقل کی نگاہ میں یہ حالت محال ہے کیونکہ مستلزم اجتماع ضدین ہے" (رسالہ ۷)

جنید کا مسلک یہ ہے کہ جب سالک کو وہ تنویر قلب حاصل ہو جاتی ہے جسے اصطلاح میں توحید کہتے ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر اسے حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے اور بات بھی معقول ہے جب تک سالک کو حضوری حاصل نہ ہو وہ موحد نہیں بن سکتا اور حضوری کے لئے مشاہدہ شرط ہے اور جب مشاہدہ کی نعمت حاصل ہو گئی تو اب خدا کی ہستی میں کوئی شک نہ رہا اور یہی معرفت ہے۔

جنید کہتے ہیں "توحید ایزدی کا علم اور چیز ہے اور مقام توحید پر فائز ہونا اور چیز ہے۔ یعنی علم توحید"

---

[1] آتا ہے جو بزم رندان میں تو عقل و خرد کو چھوڑ کے آ
اے عقل و خرد کے دیوانے یاں عقل و خرد کا کام نہیں (جگر مراد آبادی)

مشاہدۂ توحید سے متغائر ہے۔ زبان سے اللہ کو ایک کہنا بہت آسان ہے لیکن اس کی وحدت کا مشاہدہ کرنا بہت مشکل ہے اور اسی لئے ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے[1]۔ اللہ کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد کوئی مسلمان غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

جنید کی اصطلاح میں معرفت آخری منزل نہیں ہے بلکہ توحید کے مقام پر فائز ہو جانا آخری منزل ہے اور یہی مقصود حیات ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سالک کو اللہ کا علم ہی حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ وہ علم باری سے بھی حصۂ وافر حاصل کر لیتا ہے اور یہ وہ اعزاز ہے جس کو نہ بذریعہ الفاظ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ عوام اسے سمجھ سکتے ہیں۔ جنید کی رائے میں موحد ہی عارف ہوتا ہے۔

اقتباسات از رسائل جنید

ہم نے گذشتہ صفحات میں جنید کے رسائل سے ان کی بنیادی تعلیمات کا خاکہ ہدیۂ ناظرین کر دیا ہے لیکن اس خیال سے کہ اس کتاب کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عظیم صوفی کے ارشادات بھی درج کئے جائیں تاکہ تاریخ تصوف کا طالب علم ہر دور کے صوفی کے افکار سے براہ راست آگاہ ہو سکے۔ ہم ذیل میں رسائل سے دو اقتباس بھی درج کئے دیتے ہیں۔

پہلا اقتباس: من کلام الامام ابی القاسم الجنید بن محمد قدس اللہ روحہ ونور ضریحہ فی الفرق بین الاخلاص والصدق (یہ ایک خط ہے جو جنید نے ایک دوست کے اس سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ اخلاص اور صدق میں کیا فرق ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

تم نے مجھ سے اخلاص اور صدق میں فرق دریافت کیا ہے۔ واضح ہو کہ صدق کا مفہوم ہے فرائض مذہبی ادا کرنے کے بعد اپنے نفس کی حفاظت کرنا اور شدید نگرانی کرنا اور یہ دیکھنا کہ کہیں نفس میں ریاء یا کبر تو پیدا نہیں ہو گیا (جسی کو محاسبہ بھی کہتے ہیں۔ تمام مذہبی فرائض کا بجا لانا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ اور یہ بھی مدّ نظر رہے کہ یہ تعمیل احکام حسن نیت اور سچی عبودیت کے جذبے سے کی جائے (جب تک اللہ سے محبت نہ ہو آدمی میں صدق کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی)

---

[1] حضرات صدیق اکبر رضؓ، فاروق اعظم رضؓ اور عثمان غنی رضؓ بھی زبان سے اللہ کو ایک کہتے تھے۔ ہم بھی ایک ہی کہتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ اکاسرہ اور قیاصرہ وقت ان رضؓ کے سامنے سرنگوں تھے۔ اور ہم اپنے زمانے کے اکاسرہ اور قیاصرہ کے سامنے سرنگوں بھی ہیں سربسجود بھی۔ (مؤلف)

اس لئے صدق در اصل انسان کے ارادے کی ایک صفت ہے۔ صدق انسان کو نفس امارہ کی پیروی سے روکتا ہے اور طاعتِ حق میں غفلت یا سستی سے باز رکھتا ہے۔

صدق اخلاص پر مقدم ہے اور اخلاص صدق کی ایک صفت ہے۔ اخلاص بنیادی طور پر ذاتی ارادے سے توحید باری کے اعتراف کا نام ہے اور اس اعتراف کے بعد پھر تمام نواہی سے اجتناب کرنا (اگر ایک مسلمان اقرار توحید کے بعد خدا کی نافرمانی بھی کرتا ہے تو وہ اپنے اقرار میں مخلص نہیں ہے بلکہ نفاق کے پہلے درجے میں ہے) اخلاص صدق سے افضل ہے۔ اخلاص سے برتر کوئی شے نہیں ہے۔ اخلاص کے بعد صدق کا مرتبہ ہے (اور مومن کے لئے یہ دونوں بہت ضروری ہیں)

صدق تین معانی میں مستعمل ہے (۱) صادق بلسانہٖ (۲) صادق فی فعلہٖ (۳) صادق بقلبہٖ۔ صادق فی القول وہ ہے جو ہر حال میں سچ (حق) بولتا ہے۔ اس کی زبان سے کلمۂ حق کے علاوہ کچھ نہیں نکل سکتا خواہ وہ اس کے موافق ہو یا مخالف (مثلاً وہ اپنا نقصان گوارا کرے گا لیکن جھوٹ نہیں بولے گا) صادق وہ ہے جو تاویلاتِ باطلہ اور فریب یا تدلیس سے اجتناب کرتا ہے۔ صادق فی الفعل وہ ہے جو اپنے ساتھ کوئی بڑی یا رعایت نہیں کرتا۔ جو دوسروں سے کہتا ہے اس پر خود بھی عمل کرتا ہے۔ راستی کے مقابلے میں ذاتی آسائش کو قربان کر دیتا ہے۔ صادق فی النیت وہ ہے جو احکام الٰہی کی تعمیل اس لئے کرتا ہے کہ وہ دل سے اللہ کو محبوب رکھتا ہے۔

اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ دل و جان سے ذاتِ باری تعالیٰ کو اپنی تمام تر توجہاتِ قلبی کا مرکز بنالے۔ اس کے سوا نہ کسی کو مقصود بنائے نہ مطلوب ٹھیرائے۔ اسی کی طرف راغب رہے اسی کے نام کی مالا جپتا رہے اسی کا دھیان کرے اسی سے لو لگائے۔ اگر دنیا والے اس کی تحقیر کریں تو اس کے اطمینان میں خلل واقع نہ ہو۔ اسے کسی قسم کا رنج و ملال نہ ہو اور اگر دنیا والے اس کی تعریف کریں تو اسے ناگوار ہو کیونکہ اسے یہ خوف دامنگیر ہوگا کہ مبادا میرے اخلاص میں کمی یا نقص واقع ہو جائے (صادق، لومۃ لائم اور مدح مادح دونوں سے بے نیاز ہوتا ہے) اخلاص کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مخلص ہے وہ لازماً صادق بھی ہے اور جب ایک شخص مقامِ صدق حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اخلاص کی نعمت بھی بطور فضل عطا فرما دیتا ہے!!

باب آخر فی التوحید

"اعلم ان اول عبادۃ اللہ عزّ وجل معرفۃ الخ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جان لو کہ خدا کی عبادت کی پہلی شرط اس کی معرفت ہے اور معرفت کی اصل یہ ہے کہ تم اس بات کا سچے دل سے اقرار کرو کہ وہ واحد لاشریک ہے اور اس کی احدیت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے بارے میں ان سوالات کے جوابات کے امکان کی مکمل نفی کر دو۔ مثلاً وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیوں کر ہے؟ کہاں ہے؟ کب سے ہے؟

ہم صرف خدا ہی کی مدد اور توفیق سے اس کی طرف راہ پا سکتے ہیں۔ جب توفیق ایزدی کسی بندے کے شامل حال ہوتی ہے تو اسے توحید کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے اور جب بندے کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کے احکام کی دل و جان سے اتباع کرنے لگتا ہے۔ اس اتباع سے اسے بارگاہ ایزدی میں قرب حاصل ہوتا ہے اور قرب کا ثمرہ مشاہدہ ہے اور جب سالک ذات باری کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کی ذاتی ہستی اس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح آفتاب طلوع ہوتا ہے تو ستارے معدوم یا کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب ذات ایزدی کا آفتاب قلب سالک کے افق پہ طلوع ہوتا ہے تو اس کا انفرادی وجود فنا ہو جاتا ہے اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ درحقیقت اللہ کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں ہے) اس کی انفرادی ہستی کی فنا کے بعد اس کی روحانی ہستی کامل طور سے مصفّٰی ہو جاتی ہے اور جب یہ صورت ہوتی ہے تو اس کے اوصافِ شخصی یا نفس کے تقاضے سب زائل ہو جاتے ہیں اور اسے حضوری کاملہ نصیب ہو جاتی ہے۔ جب وہ پورے طور سے اللہ کے حضور میں زندگی بسر کرتا ہے تو اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس پر غیب و حضور دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں وہ حاضر بھی ہوتا ہے غائب بھی ہوتا ہے (نفس کے اعتبار سے مردہ ہوتا ہے روح کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے) جہاں وہ نہیں ہے وہاں وہ موجود ہوتا ہے اور جہاں وہ ہے وہاں موجود نہیں ہوتا[1]۔ خدا کی ذات میں موجود ہو کر اور اپنی ذات میں (یا اپنی ذات کے اعتبار سے) معدوم ہو کر وہ

---

[1] جنید کی تحریر میں اس قسم کے مغلق جملے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ میں نے ان کا آسان عام فہم انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ نمونے کے طور پہ ایک جملے کا ترجمہ لفظی کر دیا ہے۔ اس کا مطلب آسان لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں :-

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا مقام لاہوت نہیں ہے بلکہ ناسوت ہے۔ لیکن جب سالک ناسوت سے ترقی کر کے لاہوت میں پہنچتا ہے تو گویا وہ وہاں پہنچا، جہاں اسے نہیں ہونا چاہیئے تھا اور اس کا مقام ناسوت ہے اس لئے اسے وہاں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہ وہاں نہیں ہے بلکہ لاہوت میں ہے۔ اس لئے یہ کہا کہ جہاں وہ نہیں ہے وہاں موجود ہے اور جہاں اسے ہونا چاہیئے وہاں نہیں ہے (مؤلف)

خدا کی ذات میں (خدا کے ساتھ) بھی موجود ہوتا ہے اور اپنی ذات میں بھی موجود ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ اپنے نفس پر موت وارد کرتا ہے پھر اللہ اُسے دوبارہ حیات نو عطا کرتا ہے اور فنا فی اللہ ہونے کے بعد بقا باللہ کا تاج اس کے سر پر دھرا جاتا ہے یعنی وہ دوبارہ انسانی صفات سے متصف ہو کر عوام الناس کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے

مسئلۂ اُخریٰ (دوسرا مسئلہ)

اعلم انک محجوب عنک بک الخ

جان لو کہ تم خود اپنا حجاب ہو جو تمہیں تم سے پوشیدہ کر رہا ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ تم خدا تک نہیں پہنچ سکتے لیکن تم خدا کے ذریعے سے اُس تک پہنچ سکتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ جب خدا تمہیں خود اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھاتا ہے تو گویا وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ اُس تک پہنچو اور جب وہ خود تمہیں اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو تم لازمی طور سے اُس تک پہنچنے کی سعی کرو گے۔ اس منزل پر پہنچ کر تمہارے اندر جستجو کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور تم وہ اعمال بجا لاتے ہو جن کی بدولت خدا رسی کی راہیں تم پر کھولی جاتی ہیں پس خدا تمہاری کامیابی کی خاطر تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم فنا فی اللہ ہو کر ابدی زندگی حاصل کر لیتے ہو۔

جان لو کہ آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم ان کی جو خدا کی جستجو کرتے ہیں دوسری قسم ان کی جو اس کے دروازے تک پہنچ کر وہاں مقیم ہو جاتے ہیں تیسری قسم ان کی جو اندر داخل ہو کر وہاں مقیم ہو جاتے ہیں۔

جنیدؒ سے سوال کیا گیا کہ اہل معرفت کی عبادت کا منتہیٰ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے نفوس پہ کامل فتح و ظفر حاصل کرنا۔

(ختم شد)

کراچی میں "میثاق" کے سول ایجنٹ

عوامی کتب خانہ : بولٹن مارکٹ

(بقیہ اسلامی ریاست)

پائے گا۔ اسلامی ریاست بھی، جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے۔ اسی حقیقی اسلام کو پیش نظر رکھتی ہے اور اپنی تعلیم و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام شعبوں کو رات دن اس بات کے لیے سرگرم رکھتی ہے کہ اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کا سیاسی نظام صرف ظاہری اسلام ہی سے بحث کرتا ہے اور اسی سے بحث کرسکتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر جیسا کہ آپ نے دیکھا، خارجیت اور انارکزم تک کے لئے گنجائش نکل آتی ہے بشرطیکہ ان سے شرائطِ شہریت کی خلاف ورزی نہ سرزد ہوئی ہو۔ جہاں تک لوگوں کی نیتوں، ارادوں اور دل کے مخفی منصوبوں کا تعلق ہے اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ جس چھاج سے لوگوں کو پھٹکے گا وہ چھاج باطل کے خفیف سے خفیف ذرّوں کو بھی الگ کر کے رکھ دے گا۔ کیونکہ خدا کا چھاج غیب بین اور غیب دان ہے۔ لیکن ایک اسلامی ریاست جس چھاج سے لوگوں کو پھٹکتی ہے وہ باطل کے اُن ذرّوں کو حق کے اجزا سے الگ نہیں کرسکتا جن کے اوپر کسی شکل میں حق کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو یا جو حق کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت سے لگے لپٹے ہوں؛

ہم سے طلب فرمائیے

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر ترین لیکن جامع ترین کتاب

النبیّ الخاتم

تالیف: مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی

۱۶×۲۰/۱۶ صفحات ۱۸۰ : کاغذ سفید: قیمت -/۳ روپے

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشئ مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۴۸۴ مجلد معہ ڈسٹ کور

قیمت ۱۴ روپے

دعواتِ حق حصّہ اوّل

افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ

افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ

مہتمم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک و امیر انجمن خدام الدین نوشہرہ - مولانا سمیع الحق

شائع کردہ: مکتبہ حکمۃ الاسلامیہ نوشہرہ

قیمت: -/۳ روپے

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام

از قلم : ———— اسرار احمد

- ✶ فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- ✶ بنیادی نقطہ نظر
- ✶ عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- ✶ مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل
- ✶ علوم عمرانی کا ارتقاء
- ✶ اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں
- ✶ تعبیر کی کوتاہی
- ✶ احیائے اسلام کی شرط لازم : تجدید ایمان
- ✶ کرنے کا اصل کام
- ✶ عملی اقدامات

"………Many official and unofficial, political and non-political agencies have recently been trying to issue calls and manifestoes for starting a renaissance movement in the thought of Islam. The most recent and by far the most interesting is a pamphlet by Dr. Israr Ahmad, ………This pamphlet, "Islam Ki Nisha'at-e-Sania", is a very important document, and needs to be studied by all Muslims, because it makes the attempt, rare in these days, to come to grips with the fundamental issue of our situation as Muslims in the modern world………"

'Cultural Notes' *by* **'ZENO'**

The Pakistan Times, Lahore.
Friday, June 14, 1968.

سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸ صفحات ۵۶ ۔ طباعت آفسٹ ، قیمت ایک روپیہ

★

—: شائع کردہ :—

دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ 1 (فون 69522)

Regd. No. L. 7360
Monthly "MEESAAQ" Lahore
Vol. 16 | AUGUST 1969 | No. 8

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول ——— مشتمل بر

مقدمہ و تفاسیر آیۂ بسم اللہ ، سورۂ فاتحہ ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران

..... بڑی ہی فکر انگیز اوراپنے رنگ میں
بالکل منفرد تفسیر..... اہل علم اور
طلبۂ فن کے مطالعے میں رہنے کے قابل اور بہتوں
کے لئے ایک قابل قدو رہنما... عبارت متین و محکم ، شستہ و
سلیس ، شاندار اور باوقار ، مولویانہ نہیں ادیبانہ... مصنف
زندگی بھر اور کچھ نہ کرتے صرف یہی ایک کتاب اپنی
یادگار چھوڑ جاتے تو بھی خدمت قرآن کا حق ادا کر جاتے"
(مولانا عبدالماجد دریابادی ، مدیر 'صدق جدید')

سائز ۲۲×۲۹/۸ ، صفحات ۸۸۰

عمدہ دبیز سفید کاغذ ——— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ھدیہ تیس روپے ——— محصول ڈاک : ڈھائی روپے

(بتیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

-: شائع کردہ :-

دار الاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ 1 (فون 69522)

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ لاہور